ماورا

ن۔م۔راشد

لاہور
مکتبۂ اردو

ماورا

ن۔ م۔ راشد

لاہور
مکتبۂ اُردو

فہرس

انتساب ، ۳
مصنّف کے حالات ، ۴
تعارف ، ۵
دیباچہ ، ۲۳
میں اُسے واقفِ اُلفت نہ کروں ، ۳۳
رخصت ، ۳۵
انسان ، ۳۹
خواب کی بستی ، ۴۱
گناہ اور محبّت ، ۴۳
ایک دن — لارنس باغ میں ، ۴۵
ستارے ، ۴۷
مری محبت جواں رہے گی ، ۴۹
بادل ، ۵۱
فطرت اور عہدِ نو کا انسان ، ۵۳
مکافات ، ۵۶
شاعر کا ماضی ، ۵۹
خوابِ آوارہ ، ۶۱
زندگی ، جوانی ، عشق ، حسن ، ۶۳

رفعت، ۶۶
دلسوزی، ۶۸
جرأتِ پرواز، ۶۹
وادیٔ پنہاں، ۷۲
طلسمِ جاوداں، ۷۵
ہونٹوں کا لمس، ۷۸
اتفاقات، ۸۱
حزنِ انسان، ۸۴
ایک رات، ۸۶
سپاہی، ۸۸
زوال،
اظہار، ۹۳
آنکھوں کے جال، ۹۵
گناہ، ۹۸
عہدِ وفا، ۱۰۰
شاعرِ درماندہ، ۱۰۳
دریچے کے قریب، ۱۰۵
رقص، ۱۰۸
بے کراں رات کے سناٹے میں، ۱۱۱
شرابی، ۱۱۳
انتقام، ۱۱۵
اجنبی عورت، ۱۱۷
خودکشی، ۱۱۹

فیض کے نام ——

مصنف:

ن۔م۔ راشد

ولادت: پنجاب۔ یکم اگست ۱۹۱۰ء

تعلیم: گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے [اقتصادیات]

موجودہ پتہ: آل انڈیا ریڈیو دہلی

تعارف

راشد کی شاعری اردو میں ایک نئے تجرباتی دور کی تمہید ہے۔ اس کا مقابلہ دورِ آخر کی شاعری سے نہیں کیا جا سکتا۔ راشد کی شاعری ہیئت اور مادے دونوں کے اعتبار سے ہماری مروجہ شاعری سے مختلف ہے۔ تاریخی اعتبار سے شاعروں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم کے شاعر وہ ہیں۔ جو ماضی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تاثرات۔ الفاظ اور معانی استعمال کرتے ہیں۔ اور اگر ہو سکے۔ تو ہر ممکن کوشش سے اس حلقے کے اندر رہ کر اظہار کی نئی پہنائیاں اور نئے اسلوبِ بیان تلاش کرتے ہیں۔ دوسری قسم کے شاعر وہ ہیں جن کی آواز گویا کسی نئے افق سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور ماضی کے تسلسل کو چیرتی ہوئی ہمارے دلوں میں اتر جاتی ہے راشد دوسری قسم کا شاعر ہے۔

گو اردو کی بے قافیہ شاعری عبدالحلیم شرر اور اسمٰعیل میرٹھی سے شروع ہوئی ہے۔ لیکن اوّل تو ان بزرگوں نے اس کی طرف نہایت بے دلی سے توجہ کی۔ اور ایک دو غیر مربوط کوششوں کے بعد اسے چھوڑ دیا۔ دوسرے ان میں تاثیر اور اسلوبِ بیان۔ فکر اور لباس کا وہ آہنگ اور امتزاج موجود نہ تھا۔ جو راشد کے ہاں بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ بے قافیہ شاعری سے صرف یہی

مراد نہیں۔ کہ پرانے اصولوں سے انحراف کیا جائے۔ اگر یہ انحراف صرف اسلوب تک ہی محدود ہو۔ تو یہ بہت بڑی جدت نہ ہوگی۔ گو یہ انحراف بھی بذاتِ خود ایک قابلِ قدر چیز ہے۔ لیکن راشد کے ہاں یہ انحراف داخلی اور خارجی۔ فنّی اور فکری لحاظ سے مکمل ہے۔ اور یہ چیز اُس کی شاعری کی اجتہادی حیثیت کو نمایاں کرتی ہے۔

فنّی نقطۂ نگاہ سے راشدؔ ایک صحیح باغی شاعر ہے۔ اس کا تخیل ہمیشہ ہماری موروثی زبان کے الفاظ۔ ان کے معانی۔ اسالیبِ بیان۔ بندشوں اور ترکیبوں کو توڑتا۔ پگھلاتا۔ انہیں نئے سانچوں میں ڈھالتا۔ نئی صورتیں دیتا اور ان میں سے نئے مطالب کشید کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اس کی شاعری میں نفسیاتی تحلیل اور جذباتی تسلسل ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اور اِن دونوں کے ہم آہنگ ہونے سے ایک آزاد تسلسل کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ جدید نفسیات کے ماہروں نے ذہن لاشعور کو ماپنے کیلئے آزاد تسلسل کا طریقہ ایجاد کیا ہے کِسی شخص سے مخاطب ہو کر ایک فہرست میں سے منتخب الفاظ یا فقرے بولے جاتے ہیں۔ اور اس سے کہا جاتا ہے۔ کہ وہ ہر سوال کا جواب اُن الفاظ یا الفاظ کے مجموعے سے دے۔ جو سب سے پہلے اسکے ذہن میں آئیں۔ ان جوابات سے اس فرد کی زیرِ نفسی کیفیت کے متعلق نتائج مرتب کئے جاتے ہیں۔ شعر کی بھی ایک حد تک یہی کیفیت ہے۔ شاعر کے دِل میں ایک خیال اٹھتا ہے۔ پھر اس کا ذہن لاشعور اس خیال سے وابستہ دوسرے خیالوں اور تصویروں کو کھینچ لاتا ہے۔ اور انہیں شعر کی صورت میں منتقل کر دیتا ہے۔ اس طرح سے شاعر جہاں اپنے ذہن لاشعور کے مفروضات کو قبول کر لیتا ہے۔ وہیں وہ اپنی شعری تخلیق کے عمل سے بھی کسی حد تک آگاہ رہتا ہے۔ یہ واقفیت اس کے قلبی واردات کا صحیح جائزہ ہو یا غلط۔ شاعر کے لئے ہمیشہ ایک بڑے بھاری ذہنی اضطراب کا باعث ہوتی ہے۔ اِس اضطراب پر قابو پانے کے لئے شاعر مختلف طریقے استعمال کرتا ہے۔ ہمارے پرانے شاعر [ولی سے اقبال تک] اس مقصد کے لئے اپنی ذات کو اپنے ذہن لاشعور پر محیط کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اِس طاقت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے۔ ہر ٹکڑے کو الگ الگ منطقی دلائل کے ساتھ باندھ دیا کرتے تھے۔ دوسرا طریقہ جو ہماری جدید شاعری میں آہستہ آہستہ نمایاں ہو رہا ہے۔ یہ ہے کہ شاعر اپنے

نفسی تجزیہ اور جذباتی تسلسل کے بہاؤ میں ہم آہنگی پیدا کرکے ذہن لاشعور میں سے آزاد تسلسل کو وجود میں لاتا ہے۔

اوّل الذکر طریق کار کی سب سے مکمل مثال علامہ اقبال کی شاعری ہے۔ راشد کا اسلوب عمل مؤخر الذکر طریقے یعنی آزاد تسلسل کے مطابق ہے بعض اعلےٰ درجے کے نظموں میں ایسے لمحاتی مناظر جنکا بظاہر آپس میں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ناظر کے سامنے پے در پے لائے جاتے ہیں لیکن ان مناظر کے مجموعی اثر سے ایک واضح تصویر اور ایک مکمل تاثر ناظر کے دل و دماغ پر کھنچ جاتا ہے۔ آزاد تسلسل کی یہ ایک مرئی صورت ہے۔ "اجنبی عورت" میں ارض مشرق کی زبوں حالی اور "انتقام" میں ایک فرنگی شبستان کا تاثر پیدا کرنے کے لئے راشد نے اسی نوع کی فن کاری سے کام لیا ہے۔ آزاد تسلسل راشد کا خاص انداز ہے۔ اس کی مثالیں اس کی اکثر نظموں میں ملتی ہیں۔ اس سے اس کی نظموں میں ایک خاص ایجاز اور جامعیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جو عہد حاضر کے بہت کم شاعروں کو نصیب ہے۔ اکثر اوقات اس کے ذہن لاشعور کی کھینچی ہوئی تصویریں صرف عامیوں ہی کی نہیں بلکہ عہد حاضر کے اکثر شعرا کی ذہنی تصویروں سے مختلف ہوتی ہیں۔ اور اس لئے وہ انہیں سمجھنے میں دقت محسوس کرتے ہیں۔ یہ تصویریں اتنی برق رفتاری سے ذہن لاشعور سے کھنچی چلی آتی ہیں۔ کہ ان میں فوری طور پر کسی تسلسل کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے راشد کی اکثر نظمیں مبہم سمجھی جاتی ہیں۔ اور یہ صرف راشد ہی پر کیا منحصر ہے۔ مشرق اور مغرب کی جدید شاعری بہت حد تک مبہم اور ناقابل فہم ہے۔ اس کے ذمہ دار عہد جدید کے شاعر نہیں، بلکہ ہمارا تیزی سے بدلتا ہوا معاشرتی ماحول ہے۔ اشتہارات، تفریحات، اخبارات، اور جدید افسانوی ادب کا سیلاب، ہمہ گیر لیکن بے آہنگ نظام تعلیم اس کے ذمہ دار ہیں۔ یہ اعصابی ہیجانات انسان کے تخیل اور قوت برداشت سے کہیں زیادہ ہیں۔ ہر فرد واحد کے تخیل اور ادراک کی ایک حد ہوتی ہے لیکن جدید تہذیب اور حکمت، تخیل کے دائرے کے حدود کو بے حد تیز رفتاری سے وسیع کرتی جا رہی ہیں۔ کسی تہذیب کی ترقی کا اندازہ انفرادی تخیل اور شعور کے بڑھتے ہوئے دائرے ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن اب دائرہ اتنی سرعت سے پھیل رہا ہے۔ کہ فرد اور معاشرت میں توازن برقرار رکھنا دشوار ہو رہا ہے۔ فرد چاروں طرف سے کھنچا جا رہا ہے۔ اور اندیشہ ہے

کہ یہ کشاکش اس دائرے کے مرکز یعنی روح اور اس کے محیط یعنی تخیل کے رشتہ اتحاد ہی کو منقطع نہ کردے۔

ان حالات میں شاعر کے لئے صرف دو راستے باقی ہوتے ہیں۔ یا تو وہ ان مہیجات کا حریف بن جائے۔ یعنی انہی کے مانند ہنگامی اور اعصابی شاعری پیدا کرنے لگے جس کا دل و دماغ پر وہی اثر ہو۔ جو عہدِ حاضر کی تفریحات اور اخبارات پیدا کر رہے ہیں۔ ہمارے اکثر شاعر اسی قسم کی شاعری کر رہے ہیں۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ شاعر معاشرتی ماحول کو ٹھکرا دے۔ اور اپنے گرد ایک فکری خول سا بُن لے۔ اور اس میں پناہ گزیں ہو جائے پہلی صورت میں شاعر کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ اپنے پیغام اور فکری اور تخلیقی قوتوں کو خیرباد کہہ دے۔ دوسری صورت میں وہ عوام کیلئے کسی حد تک مبہم اور ناقابلِ فہم ہو کر رہ جائیگا۔ دونوں باتیں شاعر کے لئے خطرناک ہیں۔ لیکن راشد نے دوسرے خطرے کو پہلے خطرے پر ترجیح دی ہے۔ ایک حد تک آئرلینڈ کے شاعر "YEATS" کی طرح راشد کا محاورہ بھی ذاتی اور نفسیاتی ہے۔ اس کا جذباتی تسلسل ہم آہنگ اور آزاد ہے اور وہ منطقی ماحول جو وہ اپنی نظموں میں پیدا کرتا ہے۔ اکثر پڑھنے والوں کے لئے مبہم ہے۔ شاعری کو عام طور پر فکری زاویۂ نگاہ سے پرکھنے کی عادت ہم لوگوں میں کم ہے۔ اور راشد کے جوہر کا سب سے بڑا جزو اس کی فکری شاعری ہے۔

راشد نے پرانی راہ کو یکسر چھوڑ دیا ہے۔ گویا روائت شعری کو ایک طرح سے خیرباد کہہ دیا ہے۔ روائتی شاعر کو ایک فائدہ ضرور حاصل ہوتا ہے۔ کہ اسے بہت سے کلیے تیار اور مستعمل مل جاتے ہیں۔ اسے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاعری میں عام لوگوں کا ذاتی تجربہ اور تخیل کس حد تک وسیع ہے۔ اور وہ اس سے باہر جانے کی کوشش نہیں کرتا۔ داخلی طور پر جو شاعری وہ کرتا ہے وہ دماغی اعصاب پر ریڈیو اور سینما جیسے تفریحات ہی کا اثر پیدا کرتی ہے۔ راشد نے داخلی اور خارجی دونوں لحاظ سے صدیوں کے فرسودہ راستے کو چھوڑ دیا ہے۔ روایت کو بھی اور اس ہنگامی اور اعصابی شاعری کو بھی جو اب غالباً تلذذ پیدا کرنے کے سوا کسی کام کی نہیں۔ اس وجہ سے راشد کی شاعری سے کیف و سرور کا کماحقہ اکتساب کرنے کے لئے اُس کے ذہنی تسلسل

کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

خارجی طور پر ایک مربوط۔ ہم آہنگ سماجی گروہ کا شاعری پر دہی اثر ہوتا ہے۔ جو داخلی طور پر شعری روایات کا۔ شاعری کی تاریخ سے ظاہر ہے۔ کہ اِس صنف نے اُنہی زمانوں میں اور انہی مقامات پر اپنی معراج حاصل کی۔ جہاں ادنےٰ مگر مضبوط اور جامع سماجی گروہ موجود تھے۔ جیسے کہ یونان کی شہری ریاستیں۔ کالیداس کا ہندوستان۔ اور الزبتھ کا انگلستان۔ لیکن جہاں کسی ملک کی حالت ابتر ہو۔ قوم مختلف حصّوں میں منقسم ہو۔ جہاں اخلاق کا تنزّل انتہائی صورت اختیار کر چکا ہو۔ یا جہاں اخلاق کے پُرانے اصول اپنی ہئیت بدل رہے ہوں۔ الغرض جہاں انسانی تخیل کا دائرہ واضح اور متعین نہ ہو۔ وہاں سچی شاعری کا مواد نہایت مشکل سے دستیاب ہوتا ہے۔ اور اس سے سچے شاعر کا کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ شاعر ان حالات میں بظاہر اس لئے مبہم ہو جاتا ہے۔ کہ وہ اِس انتشار میں اپنے آپ کو مدغم نہیں کر دینا چاہتا۔ اس مرگ انبوہ کو جشن نہیں بنانا چاہتا۔ اس کی فکری افتادِ طبع اسے ایک منفرد اکائی بننے پر مجبور کرتی ہے۔ چنانچہ اس کی آواز سمجھنے کے لئے محض جبلت ہی درکار نہیں۔ بلکہ ایک فکری کوشش اور اُس کے ذہنی تسلسل کو سمجھنے کا ادراک بھی ضروری ہے۔ دوسری طرف شاعر بھی اس کوشش میں ہوتا ہے کہ وہ اس فکری رو کو عوام تک پہنچا دے۔ راشد اور اسکے رفقا جو پہلے ایک مرکز سے وابستہ تھے۔ اب آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے ہیں۔ تاکہ ان میں اور زندگی میں ایک مضبوط رشتے کی بنیاد پڑ سکے۔

راشد کی شاعری جنگ عظیم کے بعد کی شاعری ہے۔ بظاہر یہ زمانہ انقلاب کا ہے۔ اس دور میں ایشیا کے اکثر حصوں میں صنعتی۔ معاشرتی اور سیاسی بیداری پیدا ہوئی ہے۔ انتخابات۔ جمہوریت اور عوام کی رائے دہندگی کے ہنگامے ہیں۔ قدیم فرسودہ گندے معاشرتی نظام کو تباہ کر دینے کی آرزوؤں اور ارادوں کے چرچے ہیں۔ وطنیت کی ایک لہر ہے۔ جو ایشیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ ہندوستان میں بھی جہاں ان نئے ارمانوں کے سایوں میں ملک کے شاندار مستقبل کے خاکے کھینچے جا رہے ہیں۔ وہاں ایک نئے ادب کی بھی بنیاد رکھی جا رہی ہے۔ چنانچہ شاعری میں بھی خودی۔ آزادی اور مزدور کی عظمت کے چرچے

ہیں۔ ایک سطحی۔ جذباتی قسم کی وطن پرستی اور ایک موہوم نئے دور کی آمد میں رجائی نغمے گائے جا رہے ہیں۔ لیکن راشد کی نگاہیں کچھ اور ہی دیکھ رہی ہیں۔ راشد کو یہ سب ولولے۔ یہ سب دعوے ہنگامی اور وقتی معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے خیال میں ارضِ مشرق کی روح اگر مر نہیں چکی۔ تو قریب مرگ ضرور ہے۔ مشرقی نظامِ زندگی فرسودہ ہو چکا ہے۔ اس کا مذہب اس کا تمدن اب اپنی آخری ہچکیاں لے رہا ہے۔ راشد کی شاعری میں اس اعصابی تکان۔ ذہنی جمود۔ شکستہ ایمان اور حد سے بڑھے ہوئے احساس کمتری کا پتہ ملتا ہے۔ جو صدیوں سے ارضِ مشرق پر طاری ہے۔ راشد سمجھتا ہے۔ کہ اب اس بیمار کے اچھا ہونے کی کوئی امید نہیں۔ اسے اب مر ہی جانا چاہیے۔ مرنے کی یہ خواہش جو مشرقی روح کی مٹتی ہوئی زندگی کا عکس لطیف ہے۔ راشد کی شاعری میں بار بار آتی ہے۔ راشد کو مشرق کی موت ناگزیر نظر آتی ہے۔ لیکن اسے اس کا سسک سسک کر مرنا بہت ناگوار ہے۔ یہ احساس شدید جو مشرق کے تنزلِ حیات سے ہویدا ہے۔ اس کی قوت متخیلہ پر پوری طرح چھا گیا ہے۔ اور بار بار کوندے کی طرح یاسیت کے کہرے میں لپکتا ہے:

"تجھے معلوم ہے مشرق کا خدا کوئی نہیں!"

مشرقی روح کے مٹ جانے کی خواہش کا اظہار دورِ جدید کی شاعری میں راشد کے سوا کسی شاعر کے کلام میں موجود نہیں۔ کیونکہ ہمارے اکثر شاعر ایک نام نہاد رجائی شاعری کے جال میں گرفتار ہیں۔ یہ خواہش راشد کے جوہر کا جزو لاینفک ہے۔ اور حالات کی صحیح آئینہ دار۔ راشد کو کسی نام نہاد خودی کا زعم نہیں۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے۔ کہ یہ شے لطیف اب مشرق میں نایاب ہوتی جا رہی ہے:

"ان میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ایک دلہن سی بنی بیٹھی ہے۔
ٹمٹماتی ہوئی ننھی سی خودی کی قندیل
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے ان میں سے کوئی شعلہ جوالہ بنے!"

[دریچے کے قریب]

ذاتی خودی تو کم و بیش ہر شخص میں موجود رہتی ہے۔ اس کے بغیر زیست ممکن نہیں۔ لیکن یہ "ٹمٹماتی ہوئی ننھی سی خودی کی قندیل" ایسی نہیں کہ شعلہ جوالہ بن کر بھڑک اُٹھے۔ اور مشرقی روح کے ویرانوں اور "سنگین تاریکیوں" میں اجالا کر دے۔ نئے دور کی آمد کے جو راگ اب گائے جا رہے ہیں ٹھیک اسی طرح گذشتہ جنگ عظیم کے زمانے میں گائے گئے تھے۔ لیکن نتیجہ وہی نکلا۔ یعنی مشرق بدستور غلام اور نیم مردہ رہا۔ اور اس کی روح کو توانائی حاصل ہوئی نہ صحت۔ انہی باتوں کا جائزہ لیکر کئی بار راشد کا تخیل جہنمی اور عفریتی بن جاتا ہے۔ خواہش مرگ کا اظہار راشد کے کلام میں دو طرح اجاگر ہوتا ہے۔ انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر۔ انفرادی طور پر وہ دیکھتا ہے کہ "زندگی ایک زہر بھرا جام ہے"۔ اور "ماورا" کی پہلی نظم —— کہ "میں اُسے واقفِ اُلفت نہ کروں" بظاہر ایک رومانوی تخیل کی تخلیق معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دوسرا بند پڑھتے ہی ہمیں شاعر کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

سوچتا ہوں کہ ابھی رنج سے آزاد ہے وہ
واقفِ درد نہیں خوگرِ آلام نہیں
سحرِ عیش میں اس کی اثرِ شام نہیں
زندگی اس کے لئے زہر بھرا جام نہیں

راشد نے اپنی شاعری کی ابتدا وہاں سے کی ہے۔ جہاں بہت سے شاعر اپنی شاعری کو ختم کر دیتے ہیں۔ یعنی "اثرِ شام" "زندگی —— اِک زہر سے بھرا ہوا جام" —— یہ لہر اس کی انفرادی زندگی میں بار بار آتی ہے۔ "کہ ایک زہر سے لبریز ہے شباب مرا" —— "کہ ایک خواب ہیں بے مدعا رواں ہیں ہم" "زندگی اِک کہنہ آہنگ مسلسل ہے۔" اور "سرزمین زیست ایک افسردہ محفل ہے" "غم کا بحرِ بے کراں ہے یہ جہان" "زندگی پر اندوہ سایہ ریز ہے۔" "زندگی میرے لئے ایک خونی بھیڑیئے سے کم نہیں" —— افسردگی۔ بے رونقی، اندوہ شاعر اس شدّتِ احساس کے بارِ گراں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ وہ اس جہنمی زندگی سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے —— فرار —— "اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں"

اور جب زندگی سے پناہ مانگتے ہوئے بھی اسے اس ماحول اور اس زندگی میں رہنا پڑتا ہے۔ تو اُس کی روح آزاد ہونے کے لیے بیتاب ہو جاتی ہے۔ اور وہ خودکشی کے لئے تیار ہو جاتا ہے "خودکشی" اس مجموعے میں آخری نظم ہے۔ اور انفرادی اور اجتماعی طور پر اُس کی فکری بایت کی تکمیل —— انفرادی طور پر "خودکشی" اس کی شخصی زندگی کا منطقی انجام ہے۔ وہ زندگی جسے وہ زہر سے بھرا ہوا جام سمجھتا تھا۔ اور اجتماعی طور پر یہ "خودکشی" ارض مشرق کی موت کی خواہش یعنی "DEATH-WILL" کا اظہار ہے۔

اجتماعی طور پر "دریچے کے قریب" ارض مشرق کی موت کی خواہش کا بہترین اظہار ہے میرے خیال میں فکری اور فنی اعتبار سے "دریچے کے قریب" راشد کی بہترین نظم ہے۔ شاعر اپنی محبوبہ کو صبح کے وقت اپنی خوابگاہ کے دریچے سے ایک مشرقی شہر کا نظارہ دکھاتا ہے۔ اور ایک پرانی مسجد کے بلند مینار کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے۔

"اسی مینار کو دیکھ
صبح کے نور سے شاداب سہی
اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بیکار خدا کے مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں
ایک عفریت —— اداس
تین سو سال کی ذلت کا نشاں
ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی۔"

"ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی" —— اس بے پناہ گہری طنز کا جواب نہیں!

"دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
بے پناہ سیل کے مانند رواں
جیسے جنات بیابانوں میں

مشعلیں لیکے سرِ شام نکل آتے ہیں"

× × × × × × ×

"ان میں مفلس بھی ہیں بیمار بھی ہیں'
زیرِ افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں۔

"اجنبی عورت" میں مشرق کا یہ عفریتی اور بھیانک منظر ایک مغربی عورت کی حقیقت بین نگاہوں سے دکھلایا گیا ہے۔ مغربی مرد اور عورتیں مشرق کو ایک رومانوی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ ہاتھی۔ سپیرے۔ جادوگر۔ مہاراجے۔ بندر۔ چیتے یہ سب چیزیں ان کے ذہن میں مشرق کا ایک جامع نقشہ پیش کر دیتی ہیں۔ لیکن "اجنبی عورت" میں مشرق کی زندگی کا نقشہ ایک ایسی عورت پیش کرتی ہے۔ جس کی آنکھوں سے رومانیت کی پٹی اتر چکی ہے۔ عام مغربی عورتوں کی طرح وہ بھی مشرق میں کسی "رومان" کی تلاش میں وارد ہوتی ہے۔ لیکن یہاں آکر جب مشرق کی زبوں حالی کو دیکھتی ہے۔ تو اُسے یکایک احساس ہوتا ہے۔ کہ زندگی کے ان نہاں خانوں میں بھی اُس کے "خوابوں کا کوئی رومان نہیں"۔۔۔۔۔ "کاش اک دیوارِ ظلم میرے ان کے درمیان حائل نہ ہو" یہ "دیوارِ ظلم" اور "دیوارِ رنگ" جو مشرق اور مغرب کے درمیان کھنچی ہوئی ہے۔ کیا یہ اس دیوار کی تمثیل نہیں۔ جو یاجوج ماجوج اور ہم انسانوں کے درمیان کھڑی ہے۔ شاید یہ اس دیوار کا اجتماعی عکس ہے۔ جو "خودکشی" میں شخصی زندگی اور اس کی راحتوں کے درمیان استادہ ہے۔ اِس دیوار کو یاجوج ماجوج کی طرح نوکِ زبان سے ہزار بار چاٹنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن یہ دیوار شاید قیامت تک بدستور قائم اور استوار رہے گی۔

"دیوارِ رنگ" اور "دیوارِ ظلم" کے ذکر سے میرے ذہن میں راشد کی شعری تصویریں اجاگر ہونے لگتی ہیں۔ راشد کی تشبیہیں نفسیاتی مصوری کی حیرت انگیز مثالیں ہیں۔ تشبیہیں اُس کے کلام میں زیادہ نہیں لیکن جتنی بھی ہیں۔ بلند پایہ اور نادر۔ اکثر تو وہ محض ایک ہی کنائے سے پوری تصویر کھینچ دیتا ہے۔ "اجنبی عورت" میں اُس نے مشرقی عورت کی بے بسی۔ بے چارگی۔ اور مظلومی کا نقشہ صرف ایک لفظ سے کھینچ دیا ہے،

"یہ گھروں میں خوبصورت عورتوں کا زہرِ خند!

ایک تشبیہہ ملاحظہ ہو۔

آرزوئیں ترے سینے کے کہستانوں میں
ظلم سہتے ہوئے حبشی کی طرح رینگتی ہیں
[بے کراں رات کے سناٹے میں]

راشد نے آرزوؤں کو ظلم سہتے ہوئے حبشی کے رینگنے سے تشبیہہ دی ہے۔ یعنی ایک داخلی واردات کیلئے ایک خارجی بلکہ سیاسی کنایہ استعمال کیا ہے۔ اس سے جہاں تشبیہہ کی خوبصورتی دوچند ہوگئی ہے۔ وہاں نفس مضمون میں وسعت اور گہرائی بھی پیدا ہوگئی ہے۔ راشد اکثر خارجی حقیقتوں کو بیان کرنے کے لئے داخلی کنایوں سے کام لیتا ہے۔ اور داخلی واردات کو واضح کرنے کیلئے اس کے ڈانڈے کسی ایسے خارجی حادثے سے جا ملاتا ہے۔ کہ ان کنایوں سے پیدا کئے ہوئے خاکوں میں گویا جان سی پڑ جاتی ہے۔ اور پھر یہ تصویر داخلی اور خارجی اعتبار سے مکمل اور جامع ہو جاتی ہے۔

"بے کراں رات ۔۔۔۔۔" میں لذت اور تعیش کی گرانباری کے محسوسات کا نفسیاتی خاکہ کتنی خوبصورت، مختصر لیکن جامع تشبیہوں سے واضح کیا ہے۔

"تیرے بستر پہ مری جان کبھی
بے کراں رات کے سناٹے میں
جذبۂ شوق سے ہو جاتے ہیں اعضا مدہوش
اور لذت کی گرانباری سے
ذہن بن جاتا ہے دلدل کسی ویرانے کی
اور کہیں اس کے قریب
نیند۔ آغاز زمستان کے پرندے کی طرح
خوف دل میں کسی موہوم شکاری کا لئے
اپنے پر تولتی ہے چیختی ہے
بے کراں رات کے سناٹے میں"

لیکن شاید داخلی اور خارجی واردات کی ہم آہنگی کی بہترین مثال ہمیں "دریچے کے قریب" میں ملتی ہے:

"آمری جان مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ کس پیار سے انوارِ سحر چومتے ہیں
مسجدِ شہر کے میناروں کو
جن کی رفعت سے مجھے
اپنی برسوں کی تمنا کا خیال آتا ہے!"

مسجد کے میناروں کی رفعت سے ان تمناؤں کی بلندی کا خیال آتا ہے ۔ جو عرصہ گزرا ۔ شاعر کے دل میں پیدا ہوئیں ۔ لیکن شاعر کے دل کی گہرائیوں میں بدستور موجود ہیں ۔ اس طرح "اتفاقات" میں کہکشاں کو اپنی تمناؤں کے رہگذار سے تشبیہ دی ہے ۔ اور چاندنی رات میں پتوں پر چاند کی کرنوں کے پھیلنے کا ذکر ان حسین الفاظ میں کیا ہے:

"دیکھ پتوں میں لرزتی ہوئی کرنوں کا نفوذ
سرسراتی ہوئی بڑھتی ہے رگوں میں جیسے
اولیں بادہ گساری میں مئے تازہ و ناب"

اور کہیں اس قسم کے حسین مرقعے:

"تیرے مژگاں کے تلے گہرے خیال
بےبسی کی نیند میں الجھے ہوئے"

[ایک رات]

"اور دشمن کے گرانڈیل جوان
جیسے کہسار پہ دیودار کے پیڑ"

[سپاہی]

منفی اعتبار سے راشد کا نقطۂ نگاہ خودکشی یا فرار پر منتج ہوتا ہے ۔ خودکشی کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں ۔ یہاں فرار کے متعلق کچھ کہنا ہے ۔ راشد نے فرار کے جذبے کو نہایت شدت

سے محسوس کیا ہے۔ اور اسے نہایت خوبصورتی سے شعریت میں منتقل کیا ہے " اتفاقات " " طلسمِ جاوداں " " ہونٹوں کا لمس " " شاعرِ درماندہ " " رقص " " بے کراں رات کے سناٹے میں " اور " شرابی " منفی فرار کی بہترین مثالیں ہیں۔ شاعرانہ خلوص کے اعتبار سے بھی اور شاعرانہ دیانتداری کے لحاظ سے بھی اُس نے اپنی بے بسی میں مشرق کی بے بسی پائی ہے۔ اِس بے آہنگ نظامِ حیات کا مطالعہ کیا ہے۔ اور اس حقیقت کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے۔ راشد جب تاریخ کے اس تیز بہاؤ کو دیکھتا ہے۔ جب ارضِ مشرق کی المناک موت کے سانحہ پر غور کرتا ہے۔ تو اس کی روح غم سے لبریز ہو جاتی ہے۔ اسکی روح کا اضطراب شدت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ فرار کا راستہ تلاش کرتا ہے۔ اس راستہ پر وہ خودی کی کسی موہوم قندیل سے روشنی طلب نہیں کرتا۔ اسے خوب معلوم ہے۔ کہ یہ قندیل اب کبھی روشن نہیں ہونے کی۔ وہ کسی موہوم اور غیر متعین دُور نو کی جھوٹی خوشی سے بھی اپنے آپ کو دھوکا نہیں دینا چاہتا۔ فطرت پرست شاعروں کے مانند وہ قدرت کے خوبصورت نظاروں کو بھی اپنا ذہنی ملجا و ماوےٰ بنانے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ انسانی تخلیق کے اس بے پناہ جذبے کو اپناتا ہے جس کی تکمیل جنسی آسودگی سے ہوتی ہے۔ موت قریب ہے۔ وقت کم ہے اور اس مٹتی ہوئی زندگی کا اس سے بہتر مصرف اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ اُسے محبوب کی نرم نرم بانہوں میں گزار دیا جائے:

" تیرے رنگیں رس بھرے ہونٹوں کا لمس
اور پھر لمسِ طویل
جس سے ایسی زندگی کے دِن مجھے آتے ہیں یاد
میں نے جو اب تک بسر کی ہی نہیں "

[ہونٹوں کا لمس]

" رہنے دے اب کھو نہیں باتوں میں وقت
اب رہنے دے

اپنی آنکھوں کے طلسمِ جاوداں میں بہنے دے"

وقت کے اس مختصر لمحے کو دیکھ
تو اگر چاہے تو یہ بھی جاوداں ہو جائے گا
پھیل کر خود بے کراں ہو جائے گا

چند لمحوں کے لیے آزاد ہوں
تیرے دل سے اخذِ نور و نغمہ کرنے کے لئے
زندگی کی لذتوں سے سینہ بھرنے کے لئے"!

[طلسمِ جاوداں]

"اتفاقات کو دیکھ
اس زمستاں کی حسیں رات کو دیکھ

. . . .

تجھ کو کیا اس سے غرض ہے کہ خدا ہے کہ نہیں"
[اتفاقات]

"اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں"

[رقص]

فرار، شراب اور عورت! ــــ راشد نے فرار کی جو صورت پیدا کی ہے، اس سے وہ مطمئن نہیں۔ وہ اس تاریخی غم کو جو اس کی روح میں خوابیدہ تیرگیوں کی طرح بس گیا ہے بھلانا

چاہتا ہے لیکن اُسے معلوم ہے۔ کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ہر لحظہ اُسے یہ اندیشہ رہتا ہے کہ رقص گاہ کے چور دروازے سے کہیں زندگی اندر جھانک کر اُسے دیکھ نہ لے۔ ایک حسین اور اجنبی عورت کے ساتھ رقص کرتے ہوئے بھی وہ یہ جانتا ہے کہ راحت یہاں بھی نہیں ہے۔ جس خوشی کو وہ ڈھونڈھ رہا ہے۔ وہ یہاں بھی نہیں:-

"جانتا ہوں تو مری جاں بھی نہیں
تجھ سے ملنے کا پھر امکاں بھی نہیں
تو مری ان آرزوؤں کی مگر تمثیل ہے
جو رہیں مجھ سے گریزاں آج تک!"

[رقص]

"ورنہ اک جام شراب ارغواں
کیا بجھا سکتا تھا میرے سینۂ سوزاں کی آگ"

[شرابی]

یہ فرار کی منفی صورت ہے۔ اِس شخصی فرار کیلئے اگر راشد نے جنسی آسودگی کو منتخب کیا ہے۔ تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ کہ ہندوستان جیسے شریف ملک میں جنسی آسودگی کو بہت بری نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ فاقہ پرستی خواہ کسی رنگ میں ہو۔ بنظر استحسان دیکھی جاتی ہے بلکہ زیادہ فاقہ کرنے والے کو معاشرت میں ایک ممتاز حیثیت دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ملک میں جہاں فاقہ پرستی قومی شعار بن چکی ہے۔ جنسی فاقہ پرستی کس خطرناک حد تک بڑھی ہو گی بقول راشد:

"آہ انساں کہ ہے وہموں کا پرستار ابھی
حسن بے چارے کو دھوکا سا دئے جاتا ہے
ذوقِ تقدیس پہ مجبور کئے جاتا ہے —"

[حزنِ انساں]

"مکافات" میں راشد نے ہندوستانی نوجوانوں کی جنسی بھوک کا تجزیہ جس انداز سے کیا ہے۔

اس کی نظیر بہت کم ملے گی،

"زبانِ شوق بنایا نہیں نگاہوں کو
کیا نہیں کبھی وحشت میں بے نقاب انہیں
خیال ہی میں کیا پرورش گناہوں کو
کبھی کیا نہ جوانی سے بہرہ یاب اُنہیں!"

اب اس ضبط کی سزا بھی بھگتیے:

"یہ مل رہی ہے مرے ضبط کی سزا مجھ کو
کہ ایک زہر سے لبریز ہے شباب مرا"

اور ——

"پیامِ مرگ جوانی تھا اجتناب مرا"

یہ ضبط اور یہ اجتناب جو ہمارے بزرگوں کی روحانیت کے طفیل ہماری گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ لاکھوں جوانوں کے شباب کو زہر آلود کر چکا ہے۔ اس اجتنابِ نفس کے ردِّ عمل کی مہیب مگر سچی داستان ایک داخلی واردات کی صورت میں راشد کی زبان سے سنئے:

"لو آ گئی ہیں وہ بن کر مہیب تصویریں
وہ آرزوئیں کہ جن کا کیا تھا خوں میں نے"

"اے کاش چھپ کے کہیں اک گناہ کر لیتا
حلاوتوں سے جوانی کو اپنی بھر لیتا
گناہ ایک بھی اب تک کیا نہ کیوں میں نے؟"

راشد کے ہاں منفیت کا رنگ غالب ہے۔ اور یہ منفیت عکس ہے۔ اس نظامِ زندگی کا جو شاعر نے موجودہ دور سے ورثہ میں پائی ہے۔ جہاں تک یہ منفیت گردوپیش کے حالات کی آئینہ دار ہے۔ ہم اسے جھٹلا نہیں سکتے۔ نہ اس کی تضحیک کر سکتے ہیں لیکن اگر شاعر کی نگاہ صرف منفیت تک محدود ہے۔ تو یہ ایک خطرناک قسم کی یابسیت ہوگی۔ اور ایک رجعتی میلان کی حامل لیکن راشد

کے ہاں اس منفیت کے بین السطور تعمیرِ نو کا خیال بھی اسی شدت کے ساتھ موجود ہے۔ بلکہ ایک طرح سے یہ اس منفیت اور فرار کا ردِ عمل ہے۔ شاعر ایک ایسی کائنات کا طالب ہے۔ جس میں اہرمن اور یزداں کے جھگڑے ہمیشہ کیلئے چکا دیئے جائیں۔ جہاں مشرق اور مغرب کے درمیان مابہ الامتیاز اُٹھ جائے۔ جہاں زندگی کے تختِ خواب کے نیچے "لوٹے ہے ہیں بوئے خون الجھی ہوئی" نہ ہو" جس کی رفعت دیکھ کر خود ہمتِ یزداں ہے چور"

"جس جگہ اہرمنوں کا بھی نہیں کچھ اختیار"۔ "مشرق و مغرب کے پار"——

"مشرق و مغرب کے پار

زندگی اور موت کی فرسودہ شاہراہوں سے دور

جس جگہ سے آسماں کا قافلہ لیتا ہے نور

جس جگہ ہر صبح کو ملتا ہے ایمائے ظہور

اور بُنے جاتے ہیں راتوں کے لئے خوابوں کے جال"

. . . .

بظاہر یہ فلسفۂ حیات محض تصور پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن راشد آسمان کی نیلاہٹوں ہی میں پرواز کرنا نہیں چاہتا۔ وہ اس آسمانی نور کو زمین پر بکھیرنا چاہتا ہے۔ راشد اور اس کے رفقا کا مرکزی خیال محبت ہی ہے۔ جہاں سے سچی شاعری کی ابتدا ہوتی ہے۔ وہ محبت جو انسان اور انسان کے درمیان ایک ابدی رشتے کی طرح قائم کی جا سکتی ہے۔ اور جس کے بغیر زندگی کی بہیمیت اور شقاوت کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ راشد کا اپنا رجحان نہ انفرادیت کی طرف ہے نہ اجتماعیت کی طرف۔ انفرادیت کی خوفناک تنہائیاں شاعر کو پسند نہیں۔ اور اجتماعیت جو فردی کو بلندی کے انتہائی نقطے پر پہنچانے کی ایک کوشش کا نام ہے۔ اس میں اُسے بے شمار رخنے اور پیچ نظر آتے ہیں۔ پھر وہ کونسا نظامِ زندگی ہے۔ جس میں یہ زہر موجود نہ ہو۔ زندگی کے اس دور سے پر پہنچکر اس نے بشریت کے دامن میں پناہ لی ہے۔ یہ فلسفۂ حیات نیا نہیں لیکن اس کی بنیادی سچائی۔ اور کشش سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ راشد کی شاعری کا منبع بھی ایک نقطہ۔ بھی ایک مرکز ہے۔ وہی مرکز قدیم یعنی انسانی محبت ۔ وہ انسان اور انسان کے درمیان محبت چاہتا ہے

اور ان تمام چیزوں کو فنا کر دینے کا حامی ہے۔ جو اس کی راہ میں حائل ہیں۔ یزداں بھی اور اہرمن بھی۔ ہم میں سے اکثر اسے ناقابلِ عمل سمجھیں گے۔ جیسا کہ موجودہ دور کی زندگی نے نمایاں کر دیا ہے لیکن راشد اسی میں انسان کی نجات دیکھتا ہے:

"ایک سودا ہی سہی آرزوئے خام سہی
ایک بار اور محبت کر لوں
ایک انسان سے الفت کر لوں"

[جرأتِ پرواز]

"مراجی چاہتا ہے ایک دن اس خوابِ سیمیں کو
حجابِ فن و رقص و نغمہ سے آزاد کر ڈالوں
ابھی تک یہ گریزاں ہے محبت کی نگاہوں سے
اسے اک پیکرِ انساں میں آباد کر ڈالوں!"

[خوابِ آوارہ]

کرشن چندر

دہلی:-
۱۸ مارچ ۱۹۴۱ء

دیباچہ

"آخر الامر آہو زاغ را گفت:

"اے برادر اگرچہ سخنِ ما در غایتِ فصاحت است و اشعار کہ می خوانیم در نہایتِ بلاغت،

اما سنگ پشت را سود ندارد ...."

[انوار سہیلی]

میں اپنی منظومات کا پہلا مجموعہ اشاعت کے لئے واگزار کرتے ہوئے شعر کی تکنیک پر اپنے چند خیالات کے اظہار کی معذرت چاہتا ہوں۔ اس نگارش سے اپنی خامیوں کا جواز یا توجیہہ پیش کرنا مقصود نہیں۔ البتہ ان حضرات کا جو اس طرزِ سخن کو اپنے لئے اجنبی اور غیر مانوس پاتے ہیں۔ ذہنی قرب حاصل کرنے کی تمنا ضرور ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ نہ صرف ایک قوم کے ذہنی رجحانات دوسری قوموں کے ذہنی رجحانات سے مختلف ہوتے ہیں۔ بلکہ ایک ہی قوم مختلف زمانوں میں مختلف قسم کے ادبی مظاہرات پیش کرتی ہے چنانچہ ایک عہد میں جو اسلوبِ بیان یا اصنافِ سخن یا نظامِ فکر پسند کیا جاتا رہا ہو۔ ضروری نہیں کہ وہ کسی اور زمانے میں بھی یکساں قبولیت حاصل کر سکے۔ وقت کے مد و جزر سے

قوموں کے احساسات جمالی تصورات اور معیار اخلاق میں خود بخود فرق پڑتا رہتا ہے۔ یہ تغیر قوموں کے ادبی ذوق پر بھی اسی طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ جس طرح ان کی روزانہ معاشرت پر۔ ان حالات میں بعض اوقات قوم اپنے ادیبوں سے مختلف قسم کی نگارشات کی توقع کرنے لگتی ہے۔ اور قوم کے اس خاموش مطالبے کے جواب میں ادبی تغیرات واقع ہونے لگتے ہیں لیکن جب کوئی قوم اپنی ذہنی پسماندگی کی وجہ سے یہ مطالبہ پیش کرنے کی جرأت اور بے باکی نہیں رکھتی۔ تو کوئی جوہر قابل از خود منودار ہو کر اس جمود کو توڑ دیتا ہے۔

لیکن ان تغیرات ہی کا نتیجہ ہے۔ جو وقتاً فوقتاً از خود یا کسی جوہر قابل کی تحریک سے عمل میں آتے ہیں۔ کہ کسی قوم میں ادبیات کی باقاعدہ نشوونما رُکنے نہیں پاتی۔ چنانچہ جو ادب نئے نئے تجربات سے محروم ہو جاتا ہے۔ وہ بالاخر اس قدر فرسودہ اور جامد ہو کر رہ جاتا ہے۔ کہ ادب کا یہ بنیادی مقصد کہ وہ قوم کی ذہنی اور مادی حیثیت میں برتری پیدا کرے۔ اس قوم میں پروان ہیں چڑھتا۔

بدقسمتی سے ہمارے ایشیائی ممالک میں ادبی تغیرات بھی معاشرتی تبدیلیوں کی طرح شاذونادر ہی واقع ہوتے ہیں۔ اس کے غالباً دو بڑے سبب ہیں۔ ایک تو ہماری آب وہوا اور ہمارے جغرافیائی حالات جنہوں نے نہ صرف ہمارے جسموں میں بلکہ ہمارے ذہنوں میں بھی ایک لازوال کسالت پیدا کر رکھی ہے۔ یعنی ہمارے ذہنوں میں وہ مافوق الفطرت تحرک باقی نہیں چھوڑا جو زندگی کی بیش کی ہوئی نئی مہمات سر کرنے کے لئے ضروری ہے۔ چنانچہ ہمارے ادب میں گذشتہ کئی صدیوں سے کوئی بڑا انقلاب رونما نہیں ہوا۔ اور نہ شاید رونما ہونے کی امید ہے۔ جو تھوڑے بہت تغیرات واقع ہوئے ہیں۔ وہ بھی قوم کی طبعی کوششوں یا خود روفکر کی صلاحیتوں کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ بارہا یوں ہوا ہے۔ کہ باہر سے کسی قاہر و جابر حملہ آور نے دفعتاً اور ایک محدود عرصہ کیلئے ہمارے سیاسی اور معاشرتی نظام کو تہ و بالا کر دیا۔ تو ہمارے ادبا اور شعرا نے بھی زیادہ سے زیادہ اتنا کیا۔ کہ اپنی بے بسی اور مجبوری کے اظہار میں اور شدت پیدا کر دی۔ اور اگر زندگی کچھ عرصہ کے لئے سکون اور اطمینان کی شاہراہوں پر چلتی رہی۔ تو پھر لوٹ کر راحت طلبی کے آغوش میں سو گئے۔

دوسرا سبب ہمارا مذہب ہے۔ جس نے ہمیں کافی بالذات ہونا سکھایا ہے۔ اس کا ایک

نتیجہ تو یہ ہے۔ کہ اس سے ہماری انفرادیت کی نشو و نما بہت حد تک رک گئی ہے۔ کیونکہ ہر مذہبی خاندان کا بچہ اپنے جسم اور روح پر ایک ایسی مہر لیکر پیدا ہوتا ہے۔ جو عمر بھر اسے ایک مخصوص گروہ سے وابستہ اور ہم آہنگ کئے رکھتی ہے۔ دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے تصوّرات پر خارجی اثرات قبول کرنے کے قابل ہی نہیں رہے۔ اور جہاں کسی خارجی اثر کا نشان پاتے ہیں۔ محتاط ہو کر مدافعت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس سے مذہب کی تخفیف مقصود نہیں۔ لیکن یہ کہے بغیر بھی چارہ نہیں کہ ہمارے مذہب نے ہماری انفرادیت کو غیر ضروری حد تک صدمہ پہنچایا ہے۔ اور خود فکری کے اس نایاب جوہر کو جو ادبیات اور تہذیب کے فروغ اور ترقی کے لئے ضروری ہے۔ آہستہ آہستہ محدود کر دیا ہے۔

ہماری ہر نئی پود اپنے آباؤ اجداد کے خیالات اور تاثرات کی صدائے بازگشت لیکر آتی ہے اس کے برعکس مغرب کے فلسفے اور نظام تمدن پر نظر ڈالیں تو آپ محسوس کریں گے۔ کہ بیسویں صدی کے اشتراکی اور آمری نظریوں کی ترویج سے پیشتر معاشرت اور ادب کے ہر شعبہ میں انفرادیت کی توسیع اور نشو و نما کی کوشش نمایاں تھی۔ مغربی ادب نے اپنے لئے کوئی مقررہ نظام خیال یا شاہراہ فکر وضع نہیں کی۔ جس کے بغیر مغرب کے ادباء اور شعراء کو چارہ نہ ہو۔ ان کی خوش قسمتی سے مغرب میں افراد کے فکر و عمل، ادبی تصورات، یا ادبی اعمال پر حکومت یا کسی اور خارجی طاقت کا اس قدر غلبہ نہیں رہا۔ کہ وہ ان کی انفرادیت میں رخنہ اندازی کر سکتی۔

اردو میں سب سے پہلے جس شخص نے طرز خیال میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی وہ حالی ہے۔ وہی ہمارے ادب میں رسوم و قیود کا سب سے پہلا باغی تھا۔ اس نے ہماری مروجہ شعری تمثیلات اور تصورات دونوں میں بہت بڑا اجتہاد کیا۔ لیکن غزل کے ساتھ اس کی عرصہ دراز تک وابستگی اس بات کا ثبوت ہے کہ اُسے غزل کے مسلّمہ عقائد سے اختلاف ہو تو ہو لیکن یہ احساس بہت کم تھا۔ کہ غزل اپنی تمام وسعت اور پہنائی کے باوجود اس صلاحیت کو کھو چکی ہے جو کسی خود فکر شاعر کے جذبات کے لئے اُسے موزوں صیغۂ اظہار کے طور پر باقی رکھ سکے۔ دراصل حالی کی بغاوت کا رُخ شعوری طور پر قدیم اصناف سخن، تمثیلات اور خیالات کی طرف نہ تھا۔ بلکہ ان غیر اخلاقی احساسات کی جانب تھا۔ جو غزل کے ذریعے اظہار کی راہیں پاتے تھے۔ وہ اُس عشقیہ شاعری کے خلاف جد و جہد میں مشغول تھا۔ جو اس کے زعم میں اُس کے گروہ کے لئے اخلاقی

طور پر سود مند" نہ تھی۔ حالی کے پاس اخلاقی قدروں کے سوا ادب کو جانچنے کا کوئی اور معیار نہ تھا۔ قدیم تمثیلات اور اصناف سخن اور انداز بیان سے اس کی بغاوت محض ضمناً تھی۔ اگر حالی نے ان قدیم تمثیلات تصوّرات اور انداز بیان کو اولاً تباہ کرنے کی کوشش کی ہوتی۔ جنہوں نے ہماری شاعری اور ادب کو آج بھی زخ بستہ کر رکھا ہے۔ تو اُس نے بہت بڑا کام کیا ہوتا۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ غزل ایک ایسا صیغۂ اظہار ہے۔ جس پر ہم مشرقی بجا طور پر نازاں ہو سکتے ہیں۔ اس میں ایسی جامعیت کے ساتھ خیالات قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ کہ مغرب کے کسی صیغہ اظہار میں نہیں۔ مزید برآں اس کی اہمیت اس بات سے بھی واضح ہوتی ہے۔ کہ آج تک ہماری بلند ترین شاعری اس کے سوا کسی اور صنف سخن میں پیدا ہو ہی نہیں سکی۔ پھر اس میں پائندگی اور عالمگیری کے فوق العادت عناصر موجود ہیں۔ لیکن یہ بات تسلیم کرنا مشکل ہے۔ کہ سالہا سال سے واحد اور کثیر الاستعمال صیغۂ اظہار ہونے کے باعث غزل اپنی اکثر صلاحیتوں کو گم نہیں کر چکی۔ مخصوص تمثیلات اور تشبیہات اس کا اس قدر ناگزیر جزو بن چکے ہیں کہ نہ صرف عشقیہ تفکر میں کسی قسم کی ندرت پیدا کرنے والے کو غزل راستہ نہیں دے سکتی بلکہ اس میں غیر عشقیہ خیالات کا اظہار کرنے والے شاعر کو بھی لبا اوقات "مسلمہ" اور "سکہ بند" تمثیلات کا غلام بننا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی عالمگیری کی قدرتی خصوصیت کے باعث فارسی اور اردو میں ادنےٰ اور سہل انگار شاعروں کی وہ افراط پیدا کر دی ہے۔ کہ ہمارا ادب مجموعی حیثیت سے نہایت رکیک ہو کر رہ گیا ہے۔ پھر غزل ہی کا اثر ہے کہ ہمارے شاعر سالہا سال سے اسی ایک دائرے کے گرد چکر کاٹتے چلے آ رہے ہیں۔ جو ان کے کسی خوش نصیب مورث اعلیٰ نے صرف اپنے لئے وضع کیا تھا۔

معلوم نہیں کہ حالی خود اپنے ادبی نصب العین اور لائحہ عمل کو پورے طور پر سمجھ سکا تھا۔ یا نہیں۔ البتہ ہماری شاعری میں اس نے ایک تحریک ضرور پیدا کر دی۔ اسے تحریک ہی کہا جا سکتا ہے۔ ہیجان نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس میں شک نہیں۔ کہ حالی کی انتہائی نیک نیتی کے باوجود ہماری شاعری اپنی قدیم پستیوں سے زیادہ اونچی نہ اُٹھ سکی۔ میری رائے میں اس پستی کا خاتمہ اس طرح ہو سکتا تھا۔ کہ شاعری کو صرف اخلاقی اور معاشرتی خیالات ہی کا ذریعۂ اظہار

نہ سمجھا جاتا۔ بلکہ صیغۂ اظہار کی حیثیت سے اس میں وہ لچک اور وہ صلاحیت پیدا کی جاتی ۔ کہ اس میں بھی عشقیہ خیالات فرسودہ تمثیلات سے بے نیاز ہو کر نمودار ہو سکتے میرے نزدیک اُس وقت اور آج بھی یہی واحد طریقہ ہے جس سے ہماری شاعری کو فنی طور پر جامد ہو جانے سے بچایا جا سکتا ہے۔ اس میں اخلاقیت یا نام نہاد "حقیقت نگاری" پیدا کر کے نہیں۔

لامحالہ ادبیات میں نئے اصنافِ سخن کا رائج کرنا بنفسہ کوئی بڑا شاندار کارنامہ نہیں۔ اور کبھی کسی ادیب کو یہ امید بھی نہیں رکھنی چاہیئے۔ کہ اس کو صرف اس وجہ سے ادبیات میں کوئی پائندہ حیثیت نصیب ہوگی۔ کہ اس نے نئے اصنافِ سخن کی تلاش کی۔ یا ان کی ترویج میں کسی جدّت کا مظاہرہ کیا۔ قافیوں کو قدما کے اصول کے خلاف ترتیب دینا مصرعوں کے ارکان میں کمی بیشی کرنا یا بندوں کی ترکیب میں کسی اصول شکنی سے کام لینا یقیناً ایک سطحی حرکت ہے۔ کیونکہ قابلِ فخر بات تو صرف یہ ہے۔ کہ اوّلاً خیالات اور افکار میں اجتہاد ہو۔ پھر یہ نئے خیالات اور افکار اسلوبِ بیان کے ساتھ اس قدر مکمل طور پر ہم آہنگ ہوں۔ کہ اس ہم آہنگی سے ادیب کی انفرادیت آشکار ا ہو سکے۔ اصنافِ سخن یا ہیئتِ شعری میں جدّت ادبیات کے دریائے بے کراں کی ادنیٰ معاون ہو سکتی ہے لیکن دریا کو اس کے بغیر بھی بہنا آتا ہے!

گزشتہ چند سالوں میں ہمارے نقادوں نے اس بات پر بے حد کد و کاوش کی ہے۔ کہ آیا قوافی اور بحور شاعر کی آزاد نگاری میں سدِّراہ ہوتے ہیں۔ یا نہیں۔ ایک گروہ اس بات کا حامی ہے کہ ان قیود سے ادیب کی قوتِ اظہار قطعی طور پر شل ہو جاتی ہے۔ دوسرا گروہ انہی قیود کو شاعری کی روحِ رواں سمجھتا ہے۔ ایک اور گروہ بھی ہے۔ جس کا سلوک کس قدر منفعلانہ ہے۔ اور جو اس آزاد روی کو لاعلاج سمجھ کر گوارا کر رہا ہے۔

میری رائے میں جہاں تکنیک کی قیود کی متعصبانہ حمایت ایک فرسودہ قدامت پرستی کی دلیل ہے۔ وہاں اس کے خلاف مجنونانہ احتجاج بہت بڑی حد تک بے راہ روی کے مترادف ہے۔

قوافی اور بحور کی مروجہ تکنیک روایت پر مبنی ہے۔ یہ روایت نسلاً بعد نسل ہم تک پہنچی ہے۔ اس لیے اس تکنیک کی فرسودگی کو جانتے ہوتے بھی ہم میں سے اکثر موجودہ صورتِ حال پر صابر و شاکر رہنا پسند کرتے ہیں۔ ہم تقدیر پرست ایشیائی عام طور پر زندگی کے کسی شعبہ میں بھی نیا قدم اٹھاتے

ہوئے خوف اور بزدلی محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ مروجہ بحور و قوافی کا نظام اکثر لوگوں کو اس لئے مرغوب ہے کہ ان کے بزرگوں نے اس کی تکنیک کو متفقہ طور پر قبول کر لیا تھا۔ یہ استدلال ان کو مطمئن کرنے کے لئے کافی ہے۔ اسی طرح جو لوگ شدید اور فوری انقلابات کے علمبردار ہیں۔ وہ ندرت پرستی کے جوش میں نہ صرف قوافی اور بحور کی تعمیری حیثیت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ بلکہ ان کو منسوخ کر کے ان کے نقصان کی تلافی کسی بہتر یا نئی چیز سے کرنا بھی نہیں جانتے۔

ہر زبان کی شاعری کے بحور و قوافی کی روائتی تکنیک میں فرق اور انفرادیت کیوں ہے؟ اس کا غالباً یہ سبب ہے۔ کہ شاعری۔ ترنّم اور تناسب اصوات کے لئے ملک کی روائتی موسیقی ہی سے فیضان حاصل کرتی ہے۔ اور ہر ملک کا نظام موسیقی دوسرے ملک کے نظام موسیقی سے مختلف ہوتا ہے کیونکہ ملک کی تہذیبی روایات کے عظیم الشان سلسلے سے اس کی وابستگی ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک کی شاعری خصوصاً اردو شاعری اپنی خارجی اصل کے سبب ہمارے قومی شعور نغمہ کے ساتھ کوئی ربط و آہنگ نہیں رکھتی۔ بلکہ ایک میکانکی علم عروض پر مبنی ہے۔ جو ہم تک عرب سے ایران کے راستے پہنچا ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں جو لاتعداد گیت اردو میں لکھے گئے ہیں۔ وہ قومی شعور نغمہ کے ساتھ اردو شاعری کا ربط پیدا کرنے کی شعوری کوشش کا نتیجہ ہیں۔ اور یہ شعوری کوشش اس نام نہاد وطنیت پرستی کا نتیجہ جس نے پچھلے چند سالوں سے ہمارے ملک میں جنم لیا ہے۔ لیکن غزل نے ہندوستانی روایات نغمہ سے بے بہرہ ہونے کے باوجود ہمارے دلوں میں شعریت کا ایک سیلاب بھر دیا تھا۔ جو آج تک ایک انفرادی روایت کی حیثیت سے موجود ہے۔ اور جس نے ہمارے ملک کی روایت نغمہ پر بھی عالمگیر اثر ڈالا ہے۔ یہ جدید شاعری جو آپ کو ان صفحات میں ملیگی۔ بے شک ہندوستانی روایت نغمہ سے اسی قدر بے نیاز ہے۔ جس قدر آج تک غزلیہ شاعری رہی ہے۔ لیکن اِسے اُن روایات فکر کا قرب ضرور حاصل ہے۔ جو ہمارے ملک میں باقی دنیا کی ثقافت کے اثرات نے پیدا کی ہیں۔ گیتوں میں ملک کی حسِّ موسیقی کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی خوبی ضرور ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ ان میں بلند خیالات پیدا کرنے یا زندگی کے اسرار کو بے نقاب کرنے کی صلاحیت نہیں۔ جدید غیر ملکی تصوّرات کو چاہے ہم پسند کریں یا نہ کریں۔ مگر آج ان کی گرفت ہمارے خیالات اور عزائم پر ضرور ہے۔ اور اس سے ہمیں قطعاً مفر نہیں۔ کیونکہ تہذیب اور ثقافت جغرافیائی حدود سے نکل کر اب عالمگیر ہوتی

جا رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ان جدید تصورات نے ہمیں ایک نئی بیداری نئی توانائی اور نئی متحرک زندگی بخشی ہے۔ جو ہمارے ادب پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتی۔

قدیم اسالیبِ بیان کا ادنیٰ باغی ہونے کے باوجود میرے نزدیک یہ اعتراض قابلِ پذیرائی نہیں کہ بحروں اور قافیوں کی پابندی شاعر کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ بحور اور قوافی تو اس تناسب اصوات کے محض معاون ہیں۔ جو کسی اعلیٰ شاعر کی روح میں قدرتاً موجود ہوتا ہے۔ جس شاعر کے اندر جذبات کا وفور خیالات کی بلندی اور احساسات کی شدت ہے۔ وہ خود ایسی زبان۔ ایسا اسلوب بیان اور ایسے اصنافِ سخن پیدا کریگا۔ جو اس کے لئے موزوں ہوں بحور و قوافی کی پابندی لامحالہ اُس قدرتی ترنم کے مد و جزر میں اعتدال پیدا کرتی ہے۔ جو شاعر کے اندر موجود ہوتا ہے۔ لیکن کسی اچھے شاعر کے راستے میں رکاوٹ ڈالنا اُس کے بس کی بات نہیں چنانچہ قوافی اور بحور کی سب سے بڑی اہمیت یہی ہے کہ یہ شعر کے ترنم کو قائم رکھتے اور اظہارِ خیال کی بے راہ روی کو روکتے ہیں۔ شاعر کیلئے ترنم ایک حد تک ناگزیر ہے۔ کیونکہ نظم اور نثر میں سب سے پہلا فرق ہی یہ ہے۔ کہ اُس میں اصوات کی ہم آہنگی ہوتی ہے اور اس میں اس کا فقدان لیکن اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ کہ بحور و قوافی اصوات کی ہم آہنگی میں مدد دیتے ہوئے شاعر کی قوت اظہار کو ختم نہ کر دیں۔

قافیہ شاعر کے ذہنی ترنم اور حسِ توازن کا خالق نہیں۔ اس کا مددگار ضرور ہے۔ قافیہ شاعر کے خیالات جذبات اور قوت بیان کی تاثیر میں شدت پیدا کرتا ہے۔ ہمارے ہاں اکثر قافیے متشابہ اصوات کی بجائے متشابہ حروف پر مبنی ہوتے ہیں۔ تاہم یہ قاری کی جمالی لذت میں اضافہ کا باعث ضرور ہوتے ہیں۔ اور تمام برائیوں کے باوجود قافیے کے لئے یہ وجہِ جواز بے حد اہم ہے۔ اس کے علاوہ نظم کی ترکیب اور تعمیر اور مصرعوں کے باہمی ربط و اتحاد میں قافیہ سے بے نظیر مدد ملتی ہے اور اس کے ذریعہ عروضیوں ہی کو نہیں بلکہ خود شاعروں کو بھی اصنافِ سخن میں تمیز کرنے اور انکے تعین میں آسانی ہو جاتی ہے۔ کبھی قافیہ ہی شاعر کو دوسرے ہم رنگ یا متعلقہ الفاظ بلکہ مضمون تک سجھا دیتا ہے اور اشعار میں ایک دلکش تنوع پیدا کرنے کے لئے بھی یہ بڑا کام دیتا ہے۔ چنانچہ قافیہ کی اہمیت محض اس لئے نہیں کہ یہ شاعری میں موسیقی کی کلید ہے۔ بلکہ اس لئے بھی ہے کہ

شعر کے مضمون کی روش اور شاعر کے طریقۂ اظہار پر اس کا گہرا اثر ہے۔

اردو زبان کے سرمایہ میں عربی فارسی اور ہندی کے لامحدود متوازی اور متشابہ الفاظ ہیں۔ لیکن ایک انداز کی نظم کے لئے سب قوافی بکار آمد نہیں ہوتے۔ شاعر کو اپنی حسِ انتخاب سے کام لیکر چند قوافی ہی کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ اور یہ چیز قافیہ کے میدان کو نسبتاً محدود کر دیتی ہے۔ اردو میں قافیہ کے صحیح ادراک کی مثال مولینا ظفر علی خاں کی شاعری کے سوا غالباً کہیں نہیں ملتی۔ ان کے فن کا انتہائی کمال یہ ہے۔ کہ بکار آمد قافیوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں صرف کر دیا جائے قافیہ ان کی اکثر نظموں میں مضمون کا رہبر ہے۔ لیکن ان کی چند نظموں سے قطع نظر ان کی شاعری میں قافئے کے صوتی حسن کے احساس کا پتہ نہیں ملتا۔ قافیہ کے صوتی حسن کا شعور نظیر اکبر آبادی میر انیس اور حفیظ جالندھری کے کلام میں جس شدت سے ہے۔ وہ اردو کے دوسرے شاعروں کے ہاں نہیں۔ حفیظ جالندھری نے تو الفاظ کے صوتی حسن کے شعور سے اردو شاعری کی جمالی حیثیت کو بے حد بلند کر دیا ہے۔

چنانچہ قوافی قاری کے ذہن میں ترنم کا احساس اور اشعار کے باہمی اتحاد کا فریب ہی پیدا نہیں کرتے بلکہ درحقیقت یہ نظم کی پشت کے مہرے بھی ہیں۔ جن کی مدد سے نظم ایک مربوط اور منظم ڈھانچے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور نظم میں ایک ناقابل شکست استحکام پیدا ہو جاتا ہے۔ فنی حسن کی معراج قافئے کے بغیر بھی غالباً حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن نظم میں استحکام، دربالیدگی، پیدا کرنے کے لئے بسا اوقات اس کے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔

اس ساری بحث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قافیہ شعر کا ضروری جز نہیں بلکہ اتفاقی اور ضمنی عنصر ہے۔ جس شاعر کو قدرت نے آہنگ اور توازن کی حس عطا کی ہے۔ اسے قافیہ کے سامنے دریوزہ گری کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں۔ قافیہ اندھے کی لاٹھی کے مانند ہے۔ شاعر اندھا ہے تو اُسے یقیناً لاٹھی سے راستہ ٹٹولنے کے سوا چارہ نہیں۔ لیکن اگر شاعر کو قدرت نے آنکھیں بخشی ہیں۔ تو لاٹھی اس کی حفاظت تو کر سکتی ہے۔ مگر راستہ نہیں دکھا سکتی۔ قافیہ میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ ادنے شاعروں کے ہاتھوں میں نظم کے اندر ترنم اور مصرعوں کا باہمی ربط داتحاد پیدا کرنے کے لئے سب سے زیادہ سہل الحصول ذریعہ بن جاتا ہے۔ حالانکہ بسا اوقات

یہ ترنم اور یہ مصرعوں کا ربط و اتحاد سطحی اور نظم کے دوسرے عیوب کا محض پردہ پوش ہوتا ہے۔ کوئی ادنیٰ شاعر "سکہ بند" قافیوں کی بخشی ہوئی سہولت سے استفادہ کرنے کی ترغیب کو نہیں روک سکتا حالانکہ یہی ترغیب اکثر اس کی تباہی کے لئے راہیں صاف کرتی ہے۔

یہی حال نظم میں ارکان کا ہے۔ ارکان کے توازن سے بھی خاص قسم کا ترنم اور نظم کے مختلف مصرعوں میں یگانگت وجود میں آتی ہے۔ جو قاری کی لذت اندوزی میں اضافہ کرتی ہے۔ لیکن یہ لذت تو ایک ذہین قاری محض شعر کے مضمون اور خیال سے بھی اخذ کر سکتا ہے۔ ارکان کا توازن البتہ اس لذت کو اور تقویت دیتا ہے۔ چنانچہ اوزان شاعری کے تار و پود ضرور ہیں لیکن شاعری کی تاثیر اور جمالی حیثیت کا انحصار ان پر ہرگز نہیں۔ قدیم اصناف سخن کی اہمیت کا احساس رکھتے ہوئے بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ ادب میں حرکت پیدا کرنے کے لئے نئے ذرائع اظہار تلاش کرنا ضروری ہے۔ قدیم اوضاع سخن نے شاعروں کو فرداً فرداً اپنے راستے کے تعین میں مدد دی ہو تو ہو۔ لیکن مجموعی حیثیت سے انہوں نے ہماری شاعری کو محصور اور مجبور کر دیا ہے۔ گویا ہماری روایتی پابندیوں نے ہماری شاعری کی افقی ترقی میں تو مدد دی ہے لیکن اسکی عمودی ترقی کو ایک حد تک ناممکن کر دیا ہے۔ ان پابندیوں نے آج تک ہمارے شاعر کو ان خیالات و افکار کے اظہار پر مجبور کئے رکھا ہے۔ جو محض گزشتہ نسلوں کی صدائے بازگشت ہیں۔ وہ اپنے ذرائع اظہار کی قدرتی مجبوریوں کی وجہ سے قدیم رسمی خیالات اور تمثیلات سے آزاد ہونا اپنے لئے ممکن نہیں پاتا۔ اور عام اور عادی شاہراہوں پر گامزن ہونے پر مجبور ہے۔ اس مجبوری کا پیدا کیا ہوا تصنع نہ صرف اکثر شاعروں کی نئی ندرت کی کوششوں کے راستے میں بہت بڑا سنگِ گراں ہے۔ بلکہ ہمارے ادبیات کیلئے مجموعی حیثیت سے بھی مہلک ثابت ہو رہا ہے۔ چنانچہ مجھے یقین ہے۔ کہ ہمارے اکثر اوضاع سخن اب بھی جدید خیالات کے سیلاب کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ ان کے لئے نئے راستوں کا پیدا ہونا قدرتی ہے اور نئے راستوں کا پیدا کرنا ایک مقدس فرض۔ یہ الگ بات ہے کہ ادبیات میں ہر جدید تحریک کم فہم اور جلد باز نقادوں کی وجہ سے تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ اور صرف وہی لوگ ادبیات کے احیاء کا باعث ہوتے ہیں۔ جو آزادیٔ فکر سے بہرہ ور اور اپنی مساعی کے محاسن اور معائب سے آگاہ ہوتے ہیں۔

اردو میں یہ آزاد شاعری کی تحریک محض ذہنی شعبدہ بازی نہیں محض جدت اور قدیم راہوں

سے انحراف کی کوشش نہیں۔ اگر ان نظموں میں آپ کو کسی تخلیقی جوہر کی معمولی سی چمک، کسی قوت کا ادنیٰ سا شائبہ، کسی نئے احساس کی ہلکی سی جنبش نہ ملے۔ تو انہیں قطعی طور پر رد کر دیجئے۔ کیونکہ اجتہاد کا جواز صرف یہ نہیں کہ اس سے کس حد تک قدیم اصولوں کی تخریب عمل میں آئی۔ بلکہ یہ کہ آیا تعمیری ادب اس میں سے کسی نئی صبح کی طرح نمودار ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر یہ نہ ہو تو اجتہاد بیکار رہے۔ اجتہاد کا جواز صرف وہ خیالات و افکار ہی پیش کرتے ہیں۔ جن کی خاطر یہ راستہ اختیار کیا گیا ہو۔

اس مجموعے میں چند ابتدائی باقاعدہ نظمیں اور سانٹ بھی شامل ہیں۔ لیکن اکثر نظمیں وہی ہیں جن میں ہیئت اور فکر کے لحاظ سے قدیم راہوں سے انحراف کیا گیا ہے۔ اس مجموعے کی نظمیں میرے گذشتہ دس سال کے کلام کا انتخاب ہیں۔ اور اسے تاریخی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اکثر احباب کو اپنی بعض پسندیدہ نظمیں اس مجموعے میں موجود نہ پا کر یقیناً مایوسی ہوگی۔ لیکن انتخاب کرتے ہوئے کسی قدر سختی سے کام لئے بغیر چارہ نہ تھا۔

میں اس موقعہ پر اپنے چند بزرگوں مثلاً، مرحوم وحید کیلانی، ڈاکٹر تاثیر اور حضرت اختر شیرانی اور عزیز دوست آغا حمید کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اگر ان احباب کی رہنمائی میرے شریکِ حال نہ ہوتی تو شاید اس مجموعے کی اشاعت کا مدت تک کوئی امکان نہ تھا۔

بھائی غلام عباس بھی شکریے کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے مسودے کی نظرثانی کر کے بیش بہا مشورے دیئے۔ اور محترمی عبدالرحمٰن چغتائی کا میں خاص طور پر ممنون ہوں۔ کہ اُن کی جادونگاری نے اس کتاب کے لئے اس قدر خوبصورت سرورق مہیا کر دیا۔ شاید اسی نقش سے یہ کتاب زندۂ جاوید ہو جائے۔

ن۔م۔راشد

دہلی:

۱۴۔ جولائی ۱۹۴۱ء

میں اُسے واقفِ اُلفت نہ کروں

سوچتا ہوں کہ بہت سادہ و معصوم ہے وہ
میں ابھی اس کو شناسائے محبّت نہ کروں
رُوح کو اُس کی اسیرِ غمِ اُلفت نہ کروں
اُس کو رسوا نہ کروں وقفِ مصیبت نہ کروں

سوچتا ہوں کہ ابھی رنج سے آزاد ہے وہ
واقفِ درد نہیں، خوگرِ آلام نہیں
سحرِ عیش میں اُس کی اثرِ شام نہیں
زندگی اُس کے لئے زہر بھرا جام نہیں!

سوچتا ہوں کہ محبت ہے جوانی کی خزاں
اُس نے دیکھا نہیں دُنیا میں بہاروں کے سوا
نکہت و نور سے لبریز نظاروں کے سوا
سبزہ زاروں کے سوا اور ستاروں کے سوا

سوچتا ہوں کہ غمِ دل نہ سناؤں اُس کو
سامنے اُس کے کبھی راز کو عریاں نہ کروں
خلشِ دِل سے اُسے دست و گریباں نہ کروں
اُس کے جذبات کو میں شعلہ بداماں نہ کروں

سوچتا ہوں کہ جلا دے گی محبت اُس کو
وہ محبت کی بھلا تاب کہاں لائے گی
خود تو وہ آتشِ جذبات میں جل جائے گی
اور دُنیا کو اس انجام پہ تڑپائے گی
سوچتا ہوں کہ بہت سادہ و معصوم ہے وہ
میں اُسے واقفِ اُلفت نہ کروں

رُخصت

ہے بھیگ چلی رات پر افشاں ہے قمر بھی
ہے بارشِ کیف اور ہوا خواب اثر بھی
اب نیند سے جھکنے لگیں تاروں کی نگاہیں
نزدیک چلا آتا ہے ہنگامِ سحر بھی!
مَیں اور تم اس خواب سے بیزار رہیں دونوں
اس رات سرِ شام سے بیدار رہیں دونوں

ہاں آج مجھے دُور کا درپیش سفر ہے
رخصت کے تصوّر سے حزیں قلب و جگر ہے
آنکھیں غمِ فرقت میں ہیں افسردہ و حیراں
اک سیلِ بلاخیز میں گم تارِ نظر ہے
آشفتگی رُوح کی تمہید ہے یہ رات

اک حسرتِ جاوید کا پیغامِ سحر ہے

میں اور تم اس رات ہیں غمگین و پریشاں
اک سوزشِ پیہم میں گرفتار ہیں دونوں!

گہوارۂ آلامِ خلش ریز ہے یہ رات
اندوہ فراواں سے جنوں خیز ہے یہ رات
نالوں کے تسلسل سے ہیں معمور فضائیں
سرد آہوں سے گرم اشکوں سے لبریز ہے یہ رات
رونے سے مگر رُوح تن آساں نہیں ہوتی
تسکینِ دل و دیدۂ گریاں نہیں ہوتی!

میری طرح اے جانِ جنوں کوش ہے تو بھی
اک حسرتِ خونیں سی ہم آغوش ہے تو بھی
سینے میں مرے جوشِ تلاطم سا بپا ہے
پلکوں میں لئے محشرِ پُرجوش ہے تو بھی
کل تک تری باتوں سے مری رُوح تھی شاداب
اور آج کس انداز سے خاموش ہے تو بھی

وارفتۂ و آشفتہ و کاہیدۂ غم ہیں
افسردہ مگر سوزشِ پنہاں نہیں ہوتی!

میں نالۂ شبگیر کے مانند اُٹھوں گا
فریادِ اثر گیر کے مانند اُٹھوں گا
تو وقتِ سفر مجھ کو نہیں روک سکے گی
پہلو سے ترے تیر کے مانند اُٹھوں گا
گھبرا کے نکل جاؤں گا آغوش سے تیری
عشرت گہِ سرمست و ضیا پوش سے تیری!

ہوتا ہوں جدا تجھ سے بصد بیکسی و یاس
اے کاش ٹھہر سکتا ابھی اور ترے پاس
مجھ سا بھی کوئی ہوگا سیہ بخت جہاں میں
مجھ سا بھی کوئی ہوگا اسیرِ الم و یاس!
مجبور ہوں لاچار ہوں کچھ بس میں نہیں ہے
دامن کو مرے کھینچتا ہے "فرض" کا احساس
بس ہی میں نہیں ہے مرے لاچار ہوں میں بھی

تو جانتی ہے ورنہ وفادار ہوں میں بھی!

ہو جاؤں گا میں تیرے طرب زار سے رخصت
اس عیش کی دنیائے غیبا بار سے رخصت
ہو جاؤں گا اک یادِ غم انگیز کو لیکر
اس خلد سے، اس مسکنِ انوار سے رخصت
تو ہوگی مگر بزمِ طرب باز نہ ہوگی
یہ ارضِ حسیں جلوہ گہ راز نہ ہوگی

میں صبح نکل جاؤں گا تاروں کی ضیا میں
تو دیکھتی رہ جائے گی سنسان فضا میں
آغوش میں لے لیگی مجھے صبحِ درخشاں
کھو جاؤں گا اک کیف گہ رُوح فزا میں
"او میرے مسافر مرے شاعر مرے راشد"
تو مجھ کو پکارے گی خلش ریز نوا میں!
اُس وقت کہیں دور پہنچ جائے گا راشد
مرہونِ سماعت تری آواز نہ ہوگی!

انسان

[سانیٹ]

الٰہی تیری دُنیا جس میں ہم انسان رہتے ہیں
غریبوں، جاہلوں، مُردوں کی بیماروں کی دُنیا ہے
یہ دُنیا بے کسوں کی اور لاچاروں کی دُنیا ہے
ہم اپنی بے بسی پر رات دن حیران رہتے ہیں!
ہماری زندگی اِک داستاں ہے ناتوانی کی
بنالی اے خدا اپنے لئے تقدیر بھی تو نے
اور انسانوں سے لے لی جرأت تدبیر بھی تو نے
یہ داد اچھی ملی ہے ہم کو اپنی بے زبانی کی!

اسی غور و تجسس میں کئی راتیں گذاری ہیں
میں اکثر چیخ اٹھتا ہوں بنی آدم کی ذلت پر
جنوں سا ہو گیا ہے مجھ کو احساسِ بضاعت پر
ہماری بھی نہیں افسوس جو چیزیں "ہماری" ہیں!

کسی سے دور یہ اندوہ پنہاں ہو نہیں سکتا!
خدا سے بھی علاجِ دردِ انساں ہو نہیں سکتا!

خواب کی بستی

[سانیٹ]

مرے محبوب جانے دے مجھے اُس پار جانے دے
اکیلا جاؤں گا اور تیر کے مانند جاؤں گا
کبھی اس ساحلِ ویران پر میں پھر نہ آؤں گا
گوارا کر خدارا اس قدر ایثار جانے دے!
نہ کر اب ساتھ جانے کے لئے اصرار جانے دے
میں تنہا جاؤں گا تنہا ہی تکلیفیں اُٹھاؤں گا
مگر اُس پار جاؤں گا تو شاید چین پاؤں گا
نہیں مجھ میں زیادہ ہمتِ تکرار جانے دے!

مجھے اُس خواب کی بستی سے کیا آواز آتی ہے؟

مجھے اُس پار لینے کے لئے وہ کون آیا ہے؟
خدا جانے وہ اپنے ساتھ کیا پیغام لایا ہے
مجھے جانے دے اب رہنے سے میری جان جاتی ہے!

مِرے محبوب، میرے دوست اب جانے بھی دے مجھکو
بس اب جانے بھی دے اس ارضِ بے آباد سے مجھ کو!

گناہ اور محبّت

گناہ:-

گناہ کے تند و تیز شعلوں سے روح میری بھڑک رہی تھی
ہوس کی سنسان وادیوں میں مری جوانی بھٹک رہی تھی
مری جوانی کے دن گذرتے تھے وحشت آلود عشرتوں میں
مری جوانی کے میکدوں میں گناہ کی مے چھلک رہی تھی
مرے حریمِ گناہ میں عشق دیوتا کا گذر نہیں تھا
مرے فریبِ وفا کے صحرا میں حورِ عصمت بھٹک رہی تھی
مجھے خسِ ناتواں کے مانند ذوقِ عصیاں بہا رہا تھا
گناہ کی موجِ فتنہ ساماں اٹھا اٹھا کر پٹک رہی تھی
شباب کے اوّلیں دنوں میں تباہ و افسردہ ہو چکے تھے
مرے گلستاں کے پھول جن سے فضاءِ طفلی مہک رہی تھی

غرض جوانی میں اہرمن کے طرب کا سامان بن گیا میں
گنہ کی آلائشوں میں لتھڑا ہوا اک انسان بن گیا میں!

محبّت :-

اور اب کہ تیری محبت سرمدی کا بادہ گسار ہوں میں
ہوس پرستی کی لذّتِ بے ثبات سے شرمسار ہوں میں
مری بہیمانہ خواہشوں نے فرار کی راہ لی ہے دل سے
اور اُن کے بدلے اِک آرزوئے سلیم سے ہمکنار ہوں میں
دلیل راہِ وفا بنی ہیں ضیائے الفت کی پاک کرنیں
پھر اپنے "فردوسِ گم شدہ" کی تلاش میں رہسپار ہوں میں
ہوا ہوں بیدار کانپ کر اِک مہیب خوابوں کے سلسلے سے
اور اب نمودِ سحر کی خاطر ستم کشِ انتظار ہوں میں
بہارِ تقدیسِ جاوداں کی مجھے پھر اک بار آرزو ہے
پھر ایک پاکیزہ زندگی کے لئے بہت بیقرار ہوں میں
مجھے محبّت نے معصیت کے جہنموں سے بچا لیا ہے
مجھے جوانی کی تیرہ و تار پستیوں سے اُٹھا لیا ہے!

ایک دن — لارنس باغ میں

[ایک کیفیت]

بیٹھا ہوا ہوں صبح سے لارنس باغ میں
افکار کا ہجوم ہے میرے دماغ میں
چھایا ہوا ہے چار طرف باغ میں سکوت
تنہائیوں کی گود میں لیٹا ہوا ہوں میں
اشجار بار بار ڈراتے ہیں بن کے بھوت
جب دیکھتا ہوں اُن کی طرف کانپتا ہوں میں
بیٹھا ہوا ہوں صبح سے لارنس باغ میں!

لارنس باغ! کیف ولطافت کے خلد زار
وہ موسمِ نشاط! وہ ایامِ نوبہار
بھولے ہوئے مناظرِ رنگیں بہار کے
افکار بن کے روح میں میری اتر گئے
وہ مست گیت موسمِ عشرت فشار کے
گہرائیوں کو دل کی غم آباد کر گئے
لارنس باغ! کیف ولطافت کے خلد زار!

ہے آسماں پہ کالی گھٹاؤں کا اژدہام
ہونے لگی ہے وقت سے پہلے ہی آج شام
دُنیا کی آنکھ نیند سے جب وقت جھک گئی
جب کائنات کھو گئی اسرارِ خواب میں
سینے میں جو ہے اشک ہے میرے رُکی ہوئی
جا کر اُسے بہاؤں گا کُنجِ گلاب میں
ہے آسماں پہ کالی گھٹاؤں کا اژدہام
افکار کا ہجوم ہے میرے دماغ میں
بیٹھا ہوا ہوں صبح سے لارنس باغ میں!

ستارے

[سانیٹ]

نکل کر جوئے نغمہ خلدزارِ ماہ و انجم سے
فضا کی وسعتوں میں ہے رواں آہستہ آہستہ
بہ سوئے نوحہ آبادِ جہاں آہستہ آہستہ
نکل کر آ رہی ہے اِک گلستانِ ترنم سے!
ستارے اپنے میٹھے مدھ بھرے ہلکے تبسّم سے
کئے جاتے ہیں فطرت کو جواں آہستہ آہستہ
سناتے ہیں اُسے اِک داستاں آہستہ آہستہ
دیارِ زندگی مدہوش ہے اُن کے تکلّم سے۔

یہی عادت ہے روزِ اوّلیں سے ان ستاروں کی
چمکتے ہیں کہ دُنیا میں مسرّت کی حکومت ہو
چمکتے ہیں کہ انساں فکرِ ہستی کو بُھلا ڈالے
لئے ہے یہ تمنّا ہر کرن ان نورپاروں کی
کبھی یہ خاکداں گہوارۂ حسن و لطافت ہو
کبھی انسان اپنی گم شدہ جنّت کو پھر پالے!

مری محبّت جواں رہے گی

مثالِ خورشید و ماہ و انجم مری محبّت جواں رہے گی
عروسِ فطرت کے حُسن شاداب کی طرح جاوداں رہے گی
شعاعِ امید بن کے ہر وقت روح پر ضوفشاں رہے گی
شگفتہ و شادماں کرے گی شگفتہ و شادماں رہے گی

مری محبّت جواں رہے گی!

کیا ہے جب سے غمِ محبّت نے دیدۂ التفات پیدا
نئے سرے سے ہوتی ہے گویا مرے لئے کائنات پیدا

ہوئی ہے میرے فسردہ پیکر میں آرزوئے حیات پیدا
یہ آرزو اب رگوں میں میری شراب بن کر رواں رہے گی
مری محبّت جواں رہے گی!

مجھے محبّت نے ذوقِ تقدیس مثلِ رنگِ سحر دیا ہے
زمانہ بھر کی لطافتوں سے مری جوانی کو بھر دیا ہے
مرے گلستاں کو آشنائے بہارِ جاوید کر دیا ہے
مرے گلستاں میں رنگ و نکہت کی نزہت جاوداں رہے گی
مری محبّت جواں رہے گی!

بادل

[سانیٹ]

چھائے ہوئے ہیں چار طرف پارہ ہائے ابر
آغوش میں لئے ہوئے دُنیائے آب و رنگ
میرے لئے ہے اُن کی گرج میں سرودِ چنگ
پیغامِ انبساط ہے مجھ کو صدائے ابر
اُٹھتی ہے ہلکے ہلکے سُروں میں نوائے ابر
اور قطرہ ہائے آب بجاتے ہیں جلترنگ
گہرائیوں میں روح کی جاگی ہے ہر اُمنگ
دل میں اُتر رہے ہیں مرے نغمہائے ابر

مدّت سے لُٹ چکے تھے تمنا کے بار و برگ
چھایا ہوا تھا رُوح پہ گویا سکوتِ مرگ
چھوڑا ہے آج زیست کو خوابِ جمود نے
ان بادلوں سے تازہ ہوئی ہے حیات پھر
میرے لئے جوان ہے یہ کائنات پھر
شاداب کر دیا ہے دِل اُن کے سرود نے!

فطرت اور عہدِ نو کا انسان

[دو سانیٹ]

فطرت:

شام ہونے کو ہے اور تاریکیاں چھانے کو ہیں
آمرے ننھے مری جاں اے مرے نشہ کار آ!
تجھ پہ صدقے خلد کے نغمات اور انوار آ
آمرے ننھے! کہ پریاں رات کی آنے کو ہیں
ساری دنیا پر فسوں کا جال پھیلانے کو ہیں
تیری خاطر لا رہی ہیں لوریوں کے ہار آ
دل ترا کب تک نہ ہوگا "کھیل" سے بیزار آ
جب "کھلونے" بھی ترے نیندوں میں کھو جانے کو ہیں؟

کھیل ہیں کانٹوں سے ہے دامانِ صد پارا ترا
کاش تو جانے کہ سامانِ طرب ارزاں نہیں
کونسی شے ہے جو وجہ کاہشِ انساں نہیں
کس لئے رہتا ہے دل شیدائے نظارا ترا؟
آکہ ہے راحت بھری آغوش وا تیرے لئے
آکہ میری جان ہے غم آشنا تیرے لئے؟

انسان:

"جانتا ہوں مادرِ فطرت! کہ میں آوارہ ہوں
طفل آوارہ ہوں لیکن سرکشِ ناداں نہیں
میری اس آوارگی میں وحشتِ عصیاں نہیں
شوخ ہوں لیکن ابھی معصوم اور بیچارہ ہوں
تجھ کو کیا غم ہے اگر وارفتۂ نظارہ ہوں؟
شکر ہے زندانیٔ اہرمنِ دیزداں نہیں
ان سے بڑھ کر کچھ بھی وجہ کاہشِ انساں نہیں
میں مگر ان کے افق سے دور اک سیارہ ہوں!

شام ہونے کو ہے اور تاریکیاں چھانے کو ہیں
تو بلاتی ہے مجھے راحت بھری آغوش میں
کھیل لوں تھوڑا سا آتا ہوں ابھی آتا ہوں میں!

اب تو "دن" کی آخری کرنیں بھی سو جانے کو ہیں
اور کھو جانے کو ہیں وہ بھی کنارِ دوش میں
یہ چلی ہے رُوح نیندوں میں مری آتا ہوں میں!

مکافات

رہی ہے حضرتِ یزداں سے دوستی میری
رہا ہے زہد سے یارانہ اُستوار مرا
گذر گئی ہے تقدّس میں زندگی میری
دل اہرمن سے رہا ہے ستیزہ کار مرا
کسی پہ رُوح نمایاں نہ ہو سکی میری
رہا ہے اپنی اُمنگوں پر اختیار مرا

دبائے رکھا ہے سینے میں اپنی آہوں کو
وہیں دیا ہے شب و روز پیچ و تاب اُنہیں
زبانِ شوق بنایا نہیں نگاہوں کو

کیا نہیں کبھی وحشت میں بے نقاب انہیں
خیال ہی میں کیا پرورشِ گناہوں کو
کبھی کیا نہ جوانی سے بہرہ یاب انہیں

یہ مل رہی ہے مرے ضبط کی سزا مجھ کو
کہ ایک زہر سے لبریز ہے شباب مرا
اذیّتوں سے بھری ہے ہر ایک بیداری
مہیب و روح ستاں ہے ہر ایک خواب مرا
الجھ رہی ہیں نوائیں مرے سرودوں کی
فشارِ ضبط سے بے تاب ہے رباب مرا
مگر یہ ضبط مرے قہقہوں کا دشمن تھا
پیامِ مرگِ جوانی تھا اجتناب مرا!

لو آ گئی ہیں وہ بن کر مہیب تصویریں
وہ آرزوئیں کہ جن کا کیا تھا خوں میں نے
لو آ گئے ہیں وہی پیکرانِ اہریمن
کیا تھا جن کو سیاست سے سرنگوں میں نے

کبھی نہ جان پہ دیکھا تھا یہ عذابِ الیم
کبھی نہیں اے مرے بختِ واژگوں میں نے
مگر یہ جتنی اذیت بھی دیں مجھے کم ہے
کیا ہے روح کو اپنی بہت زبوں میں نے
اسے نہ ہونے دیا میں نے ہم نوائے شباب
نہ اس پہ چلنے دیا شوق کا فسوں میں نے
اے کاش چھپ کے کہیں اک گناہ کر لیتا
حلاوتوں سے جوانی کو اپنی بھر لیتا
گناہ ایک بھی اب تک کیا نہ کیوں میں نے ؟

شاعر کا ماضی

یہ شب ہائے گذشتہ کے جنوں انگیز افسانے
یہ آوارہ پریشاں زمزمے سازِ جوانی کے
یہ میری عشرتِ برباد کی بے باک تصویریں
یہ آئینے مرے شوریدہ آغازِ جوانی کے!

یہ اِک رنگیں غزل لیلےٰ کی زلفوں کی ستائش میں
یہ تعریفیں سلیمےٰ کی فسوں پرور نگاہوں کی
یہ جذبے سے بھرا اظہار شیریں کی محبت کا
یہ اِک گذری کہانی آنسوؤں کی اور آہوں کی

کہاں ہو او مری لیلائے۔ کہاں ہو او مری شیریں؟
سلیمے تم بھی تھک کر رہ گئیں راہِ محبّت میں؟
مرے عہدِ گذشتہ پر سکوتِ مرگ طاری ہے
مری شمعو، بجھی جاتی ہو کس طوفانِ ظلمت میں؟

مرے شعرو، مرے "فردوسِ گم گشتہ" کے نظّارو!
ابھی تک ہے دیارِ روح میں اک روشنی تم سے
کہ میں حسن و محبّت پر لٹانے کے لئے تم کو
اڑا لایا تھا جا کر محفلِ مہتاب و انجم سے!

خوابِ آوارہ

مجھے ذوقِ تماشا لے گیا تصویر خانوں میں
دکھائے حُسن کاروں کے نقوشِ آتشیں مجھ کو
اور اِن نقشوں کے محرابی خطوں میں اور رنگوں میں
نظر آیا ہمیشہ ایک رویائے حسیں مجھ کو

سرود و رقص کی خاطر گیا ہوں رقص گاہوں میں
تو اہلِ رقص کے ہونٹوں پہ آوارہ تبسّم میں
شباب و شعر سے لبریز اعضا کے ترنّم میں
تھرکتے بازوؤں میں شوق سے لرزاں نگاہوں میں
ہمیشہ جھانکتا پایا وہی خوابِ حسیں میں نے!

گذارے ہیں بہت دن حافظ و خیّام سے مِلکر
بہت دن آسکر وائیلڈ کی مدہوش دنیا میں
گذاری ہیں کئی راتیں تیاتر میں سینما میں
اِسی خوابِ فسوں انگیز کی شیریں تمنّا میں

بہت آوارہ رکھتا ہے یہ خوابِ سیمگوں مجھ کو
لئے پھِرتا ہے ہر انبوہ میں اس کا جنوں مجھ کو

مگر یہ خواب کیوں رہتا ہے افسانوں کی دُنیا میں
حقیقت سے بہت دُور، اور رومانوں کی دُنیا میں
چھپا رہتا ہے رقص و نغمہ کے رنگیں حجابوں میں
مِلا رہتا ہے نقّاشوں کے بے تعبیر خوابوں میں؟

مراجی چاہتا ہے ایک دِن اس خوابِ سیمیں کو
حجابِ فن و رقص و نغمہ سے آزاد کر ڈالوں
ابھی تک یہ گریزاں ہے محبت کی نگاہوں سے
اسے اِک پیکرِ انسان میں آباد کر ڈالوں!

زندگی، جوانی، عشق، حُسن

م — ”مری ندیم کھُلی ہے مری نگاہ کہاں
ہے کس طرف کو مری زیست کا سفینہ رواں
”وطن“ کے بحر سے دُور، اُس کے ساحلوں سے دُور؟
ہے میرے چار طرف بحرِ شعلہ گوں کیسا؟
ہے میرے سینے میں اک ورطۂ جنوں کیسا؟
مری ندیم کہاں ایسے شعلہ زار میں ہم
جہاں دماغ میں چُبھتی ہوئی ضیائیں ہیں
مہیب نور میں لپٹی ہوئی فضائیں ہیں!

”کہاں ہے آہ، مرا عہدِ رفتہ مبرا دیار

مرا سفینہ کنارے سے چل پڑا کیسے؟
یہ ہر طرف سے برستے ہیں ہم پہ کیسے شرار
ہماری راہ میں یہ "آتشیں خلا" کیسے؟

"وہ سامنے کی زمیں ہے مگر جزیرۂ عشق
جو دور سے نظر آتی ہے جگمگاتی ہوئی
کہ "سر زمینِ عجم" کے کہیں قریب ہیں ہم
ترے وطن کے نواحی میں اے حبیب ہیں ہم؟
یہ کیا طلسم ہے کیا راز ہے کہاں ہیں ہم؟
تہ زمیں ہیں کہ بالائے آسماں ہیں ہم؟
کہ ایک خواب میں بے مدعا رواں ہیں ہم؟"

ع —— "یہ ایک خواب ہے بے مدعا رواں ہیں ہم
یہ اک فسانہ ہے کردارِ داستاں ہیں ہم
ابھی یہاں سے بہت دور ہے جہانِ عجم
تصوّرات ہیں جسِ خُلد کے جواں ہیں ہم
وہ سامنے کی زمیں ہے مگر جزیرۂ عشق

جو دُور سے نظر آتی ہے جگمگاتی ہوئی
فضا پہ جس کی درخشاں ہے اِک ستارۂ نُور
شعاعیں رقص میں ہیں زمزمے بہاتی ہوئی"

م ـــــ اگر یہاں سے بہت دُور ہے "جہانِ عجم"
مری ندیم چل اس سرزمیں کی جانب چل"

ع ـــــ "اسی کی سمت رواں ہیں سفینہ راں ہیں ہم
یہیں پہنچ کے ملے گی مگر نجات کہیں
ہمیں زمان و مکاں کے حدودِ سنگیں سے
نہ خیر و شر ہے نہ یزدان و اہرمن ہیں یہاں
کہ جا چکے ہیں وہ اِس سرزمینِ رنگیں سے"

م ـــــ "مری ندیم چل اس سرزمیں کی جانب چل!"

ع ـــــ "اسی کی سمت رواں ہیں سفینہ راں ہیں ہم
یہاں عدم ہے نہ فکرِ وجود ہے گویا
یہاں حیاتِ مجسّم سرود ہے گویا!"

رفعت

[سانیٹ]

کوئی دیتا ہے بہت دُور سے آواز مجھے
چھُپ کے بیٹھا ہے وہ شاید کسی سیّارے میں
نغمہ و نور کے اِک سرمدی گہوارے میں
دے اجازت جو تری چشم فسوں ساز مجھے
اور ہو جائے محبّت پرِ پرواز مجھے
اڑ کے پہنچوں میں وہاں روح کے طیّارے میں
سرعتِ نور سے یا آنکھ کے "پلکارے" میں
کہ فلک بھی نظر آتا ہے درِ باز مجھے!

سالہا سال مجھے ڈھونڈیں گے دُنیا کے مکیں
دُور بینیں بھی نشاں تک نہ مرا پائیں گی
اور نہ پیکر ہی مرا آئے گا پھر سوئے زمیں
عالمِ قدس سے آوازیں مری آئیں گی
بحرِ خمیازہ کشِ وقت کی امواجِ حسیں
اِک سفینہ مرے نغموں سے بھرا لائیں گی!

دلسوزی

یہ عشق پیچاں کے پھول پتّے جو فرش پر یوں بکھر رہے ہیں
یہ مجھ کو تکلیف دے رہے ہیں یہ مجھ کو غمگین کر رہے ہیں
انہیں یہاں سے اُٹھا کے اِک بار پھر اُسی بیل پر لگا دو
وگرنہ مجھ کو بھی اِن کے مانند خواب کی گود میں سلا دو!

خزاں زدہ اِک شجر ہے، اُس پر ضیائے مہتاب کھیلتی ہے
اور اس کی بے رنگ ٹہنیوں کو وہ اپنے طوفاں میں ریلتی ہے
کوئی بھی ایسی کرن نہیں جو پھر اُس میں رُوحِ بہار بھر دے
تو کیوں نہ مہتاب کو بھی یارب تو یونہی بے برگ و بار کر دے!

ندیم آہستہ زمزموں کے سرودِ پیہم کو چھوڑ بھی دے
اُٹھا کے اِن نازک آبگینوں کو پھینک دے اور توڑ بھی دے
وگرنہ اِک آتشیں نوا سے تو پیکرِ رُوح کو جلا دے
عدم کے دریائے بیکراں میں سفینۂ زیست کو بہا دے!

جرأتِ پرواز

بجھ گئی شمعِ ضیا پوش جوانی میری!
آج تک کی ہے کئی بار "محبت" میں نے
اشکوں اور آہوں سے لبریز ہیں رومان مرے
ہو گئی ختم کہانی میری!
مٹ گئے میری تمناؤں کے پروانے بھی
خوفِ ناکامی و رسوائی سے
حُسن کے شیوۂ خودرائی سے
دلِ بے چارہ کی مجبوریٔ و تنہائی سے!

میرے سینے ہی میں پیچاں رہیں آہیں میری
کر سکیں رُوح کو عریاں نہ نگاہیں میری!

ایک بار اور محبت کرلوں
سعیٔ ناکام سہی
اور اک زہر بھرا جام سہی
میرا یہ میری تمناؤں کا انجام سہی
ایک سودا ہی سہی، آرزوئے خام سہی
ایک بار اور محبت کرلوں؟
ایک "انسان" سے الفت کرلوں؟
میرے ترکش میں ہے اک تیر ابھی
مجھ کو ہے جرأت تدبیر ابھی
برسرِ جنگ ہے تقدیر ابھی
اور تقدیر پہ پھیلانے کو اک دام سہی!

مجھ کو اک بار وہی "کوہکنی" کرنے دو
اور وہی "کاہ برآوردن" بھی ——؟
یا تو جی اٹھوں گا اس جرأتِ پرواز سے میں
اور کردے گی وفا زندۂ جاوید مجھے
خود بتا دے گی رہِ جادۂ امید مجھے

رفعتِ منزلِ ناہید مجھے،
یا اُتر جاؤں گا ہیں پاس کے ویرانوں میں
اور تباہی کے نہاں خانوں میں
تاکہ ہو جائے مہیّا آخر
آخری حدِّ تنزّل ہی کی اک دید مجھے
جس جگہ تیرگیاں خواب میں ہیں
اور جہاں سوتے ہیں اہرمن بھی
تاکہ ہو جاؤں اسی طرح شناسا آخر
نور کی منزلِ آغاز سے میں
اپنی اس جراَتِ پرواز سے میں!

وادیٔ پنہاں

وقت کے دریا میں اُٹھی تھی ابھی پہلی ہی لہر
چند انسانوں نے لی اِک وادیٔ پنہاں کی راہ
مِل گئی اُن کو وہاں
آغوشِ راحت میں پناہ
کرلیا تعمیر اِک موسیقی و عشرت کا شہر،
مشرق و مغرب کے پار
زندگی اور موت کی فرسودہ شہ راہوں سے دُور
جس جگہ سے آسماں کا قافلہ لیتا ہے نور

جس جگہ ہر صبح کو ملتا ہے ایمائے ظہور
اور بُنے جاتے ہیں راتوں کے لئے خوابوں کے جال
سیکھتی ہے جس جگہ پرواز حُور
اور فرشتوں کو جہاں ملتا ہے آہنگِ سرور
غم نصیب اہرمنوں کو گریہ و آہ و فغاں!

کاش بتلا دے کوئی
مجھ کو بھی اِس وادیِ پنہاں کی راہ
مجھ کو ہے اب تک تلاش
زندگی کے تازہ جولانگاہ کی
اور بیزاری سی ہے
زندگی کے کہنہ آہنگِ مسلسل سے مجھے
سرزمینِ زیست کی افسردہ محفل سے مجھے
دیکھ لے اِک بار کاش
اُس جہاں کا منظرِ رنگیں نگاہ
جس جگہ ہے قہقہوں کا اِک درخشندہ وفور
جس جگہ سے آسماں کا قافلہ لیتا ہے نُور

جس کی رفعت دیکھ کر خود ہمتِ یزداں ہے چور
جس جگہ ہے وقت اِک تازہ سُرور
زندگی کا پیرہن ہے تارتار!
جس جگہ اہرمنوں کا بھی نہیں کچھ اختیار
مشرق و مغرب کے پار!

طلسمِ جاوداں

رہنے دے اب کھو نہیں باتوں میں وقت،
اب رہنے دے،
اپنی آنکھوں کے طلسمِ جاوداں میں بہنے دے۔
تیری آنکھوں میں ہے وہ سحرِ عظیم
جو کئی صدیوں سے پیہم زندہ ہے
انتہائے وقت تک پایندہ ہے!
دیکھتی ہے جب کبھی آنکھیں اٹھا کر تو مجھے
قافلہ بن کر گذرتے ہیں نگہ کے سامنے
مصر و ہند و نجد و ایراں کے اساطیرِ قدیم:
"کوئی شاہنشاہ تاج و تخت لٹواتا ہوا
دشت و صحرا میں کوئی شہزادہ آوارہ کہیں

سر کوئی جانباز کہساروں سے ٹکراتا ہوا
اپنی محبوبہ کی خاطر جان سے جاتا ہوا!

"...................

قافلہ بن کر گذر جاتے ہیں سب
قصّہ ہائے مصر و ہندوستان و ایران و عرب!

رہنے دے اب کھو نہیں باتوں میں وقت،
اب رہنے دے!
آج میں ہوں چند لمحوں کے لئے تیرے قریب
سارے انسانوں سے بڑھ کر خوش نصیب!
چند لمحوں کے لئے آزاد ہوں
تیرے دل سے اخذ نور و نغمہ کرنے کے لئے
زندگی کی لذتوں سے سینہ بھرنے کے لئے
تیرے پیکر میں جو روحِ زیست ہے شعلہ فشاں
وہ دھڑکتی ہے مقام و وقت کی راہوں سے دُور
بیگانۂ مرگ و خزاں!
ایک دن جب تیرا پیکر خاک میں مل جائے گا

زندہ تابندہ رہے گی اس کی گرمی اس کا نور
اپنے عہدِ رفتہ کے جاں سوز نغمے گائے گی
اور انسانوں کو دیوانہ بناتی جائے گی۔

رہنے دے اب کھو نہیں باتوں میں وقت
اب رہنے دے!
وقت کے اِس مختصر لمحے کو دیکھ
تو اگر چاہے تو یہ بھی جاوداں ہو جائے گا
پھیل کر خود بے کراں ہو جائے گا
مطمئن باتوں سے ہو سکتا ہے کون ؟
روح کی سنگین تاریکی کو دھو سکتا ہے کون ؟
دیکھ اِس جذبات کے نشّے کو دیکھ
تیرے سینے میں بھی اِک لرزش سی پیدا ہو گئی!
زندگی کی لذّتوں سے سینہ بھر لینے بھی دے
مجھ کو اپنی رُوح کی تکمیل کر لینے بھی دے!

ہونٹوں کا لمس

تیرے رنگیں رس بھرے ہونٹوں کا لمس
جس سے میرا جسم طوفانوں کی جولانگاہ ہے
جس سے میری زندگی مرا عمل گمراہ ہے
میری ذات اور میرے شعر افسانہ ہیں!

تیرے رنگیں رس بھرے ہونٹوں کا لمس
اور پھر "لمسِ طویل!"
جس سے ایسی زندگی کے دن مجھے آتے ہیں یاد
میں نے جو اب تک بسر کی ہی نہیں
اور اِک ایسا مقام
آشنا جس کے نظاروں سے نہیں میری نگاہ!

تیرے اِک لمس جنوں انگیز سے
کیسے کھل جاتی ہے کرنوں کے لئے اک شاہراہ
کیسے ہو جاتی ہے ظلمت تیز گام،
کیسے جی اُٹھتے ہیں آنے والے ایامِ جمیل!

تیرے رنگیں رس بھرے ہونٹوں کا لمس
جس کے آگے ہیچ جرعاتِ شراب
یہ سنہری پھل، یہ سیمیں پھول مانندِ سراب
سوزِ شمع و گردشِ پروانہ گویا داستاں
نغمۂ بسیارگاں، بے رنگ و آب
قطرۂ بے مایہ طغیانِ شباب!

تیرے اِن ہونٹوں کے اِک لمس جنوں انگیز سے
چھا گیا ہے چار سُو
چاندنی راتوں کا نورِ بےکراں
کیف و مستی کا وفورِ جاوداں
چاندنی ہے اور میں اِک "تاک" کے سائے تلے

استادہ ہوں
جان دینے کے لئے آمادہ ہوں

میری ہستی ہے نحیف و بے ثبات
"تاک" کی ہر شاخ ہے آفاق گیر!
حملۂ مرگ و خزاں سے بے نیاز
سامنے جس کے مری دنیا ہے دُنیائے مجاز
میرے جسم و روح جس کی وسعتوں کے سامنے
رفتہ رفتہ مائل حل و گداز!

ہاں مگر اتنا تو ہے،
میری دُنیا کو مٹا کر ہو چلی ہیں آشکار
اور دُنیائیں مقام و وقت کی سرحد کے پار
جن کی تو ملکہ ہے مَیں ہوں شہریار!
تیرے رنگیں رس بھرے ہونٹوں کا لمس،
جس سے میری سلطنت تابندہ ہے
انتہائے وقت تک پایندہ ہے!

اتفاقات

آج، اس ساعتِ دزدیدہ و نایاب میں بھی،
جسم ہے خواب سے لذّت کشِ خمیازہ ترا
تیرے مژگاں کے تلے نیند کی شبنم کا نزول
جس سے دُھل جانے کو ہے غازہ ترا۔
زندگی تیرے لئے رس بھرے خوابوں کا ہجوم
زندگی میرے لئے کاوشِ بیداری ہے!
اتفاقات کو دیکھ،
اس زمستاں کی حسیں رات کو دیکھ
توڑ دے وہم کے جال
چھوڑ دے اپنے شبستانوں کو جانے کا خیال،

خوفِ موہوم تری رُوح پہ کیا طاری ہے!
اتنا بے صرفہ نہیں تیرا جمال
اس زمستاں کی جنوں خیز حسیں رات کو دیکھ!
آج، اس ساعتِ دزدیدہ و نایاب میں بھی
تشنگی روح کی آسودہ نہ ہو
جب ترا جسم جوانی میں ہے نیسانِ بہار
رنگ و نکہت کا فشار!

پھول ہیں، گھاس ہے، اشجار ہیں، دیواریں ہیں
اور کچھ سایے کہ ہیں مختصر و تیرہ و تار،
تجھ کو کیا اس سے غرض ہے کہ خدا ہے کہ نہیں؟
دیکھ پتّوں میں لرزتی ہوئی کرنوں کا نفوذ
سرسراتی ہوئی بڑھتی ہے رگوں میں جیسے
اوّلیں بادہ گساری میں مئے تازہ و ناب،
تجھ کو کیا اس سے غرض ہے کہ خدا ہے کہ نہیں؟

کہکشاں اپنی تمنّاؤں کا ہے راہگذار

کاش اُس راہ پہ مل کر کبھی پرواز کریں،
اِک نئی زیست کا در باز کریں!
آسماں دُور ہے لیکن یہ زمیں ہے نزدیک
آ اسی خاک کو ہم جلوہ گہِ راز کریں!
روحیں مل سکتی نہیں ہیں تو یہ لب ہی مل جائیں،
آ اِسی لذّتِ جاوید کا آغاز کریں!
صبح جب باغ میں رس لینے کو زنبور آئے
اُس کے بوسوں سے ہوں مدہوش سمن اور گلاب
شبنمی گھاس پہ دو پیکرِ یخ بستہ ملیں،
اور خدا ہے تو پشیماں ہو جائے!

حزنِ انسان

[افلاطونی عشق پر ایک طنز]

جسم اور روح میں آہنگ نہیں،
لذّت اندوز دلآویزی موہوم ہے تو
خستۂ کشمکشِ فکر و عمل!
تجھ کو ہے حسرتِ اظہارِ شباب
اور اظہار سے معذور بھی ہے
جسم نیکی کے خیالات سے مفرور بھی ہے
اس قدر سادہ و معصوم ہے تو
پھر بھی نیکی ہی کئے جاتی ہے
کہ دل و جسم کے آہنگ سے محروم ہے تو!

جسم ہے روح کی عظمت کے لئے زینۂ نور
منبع کیف و سرور!

نارسا آج بھی ہے شوقِ پرستارِ جمال
اور انساں ہے کہ ہے جادہ کشِ راہ طویل،

[روحِ یوناں پہ سلام!]
اِک زمستاں کی حسیں رات کا ہنگامِ تپاک
اُس کی لذّات سے آگاہ ہے کون؟
عشق ہے تیرے لئے نغمۂ خام
کہ دل و جسم کے آہنگ سے محروم ہے تو!

جسم اور رُوح کے آہنگ سے محروم ہے تو
ورنہ شب ہائے زمستاں ابھی بے کار نہیں
اور نہ بے سود ہیں ایامِ بہار!
آہ انساں کہ ہے وہموں کا پرستار ابھی
حُسن بے چارے کو دھوکا سا دیئے جاتا ہے
ذوقِ تقدیس پہ مجبور کئے جاتا ہے!
ٹوٹ جائیں گے کسی روز مزامیر کے تار
مسکرا دے کہ ہے تابندہ ابھی تیرا شباب
ہے یہی حضرتِ یزداں کے تمسخر کا جواب!

ایک رات

یاد ہے اِک رات زیرِ آسمانِ نیلگوں،
یاد ہے مجھ کو وہ تابستاں کی رات!
چاند کی کرنوں کا بے پایاں فسوں — پھیلا ہوا،
سرمدی آہنگ برساتا ہوا — ہر چار سُو!
اور مرے پہلو میں تُو — !
میرے دل میں یہ خیال آنے لگا —
غم کا بحرِ بےکراں ہے یہ جہاں
میری محبوبہ کا جسم اِک ناؤ ہے
سطحِ شورانگیز پر اُس کی رواں
ایک ساحل، ایک انجانے جزیرے کی طرف
اس کو آہستہ لئے جاتا ہوں میں

دل میں یہ جاں سوز وہم
یہ کہیں غم کی چٹانوں سے نہ لگ کر ٹوٹ جائے!
یاد ہے مجھ کو وہ تابستاں کی رات
تیرے دِل میں راز کی اِک کائنات
تیری خاموشی میں طوفانوں کا غوغائے عظیم
سرخوشِ اظہار تیری ہر نگاہ
تیرے مژگاں کے تلے گہرے خیال
بے بسی کی نیند میں اُلجھے ہُوئے ——
تیرا چہرہ آبگوں ہونے کو تھا
دفعتاً، پھر جیسے یاد آجائے اِک گم گشتہ بات
تیرے سینے کے سمن زاروں میں اُٹھیں لرزشیں
میرے انگاروں کو بے تابانہ لینے کے لئے
اپنی نکہت اپنی مستی مجھ کو دینے کے لئے!
غم کے بحرِ بیکراں میں ہوگیا پیدا سکوں
یاد ہے وہ رات زیرِ آسمانِ نیلگوں
یاد ہے مجھ کو وہ تابستاں کی رات!

سپاہی

تو مرے ساتھ کہاں جائے گی؟
موت کا لمحۂ مایوس نہیں —
قوم ابھی نیند میں ہے!
مُصلحِ قوم نہیں ہوں کہ میں آہستہ چلوں
اور ڈروں قوم کہیں جاگ نہ جائے —
میں تو اک عام سپاہی ہوں مجھے
حکم ہے دوڑ کے منزل کے قدم لینے کا
اور اسی سعیِ جگر دوز میں جاں دینے کا
تو مرے ساتھ مری جان! کہاں جائے گی؟

تو مرے ساتھ کہاں جائے گی ؟
راہ میں اونچے پہاڑ آئیں گے
دشت بے آب و گیاہ
اور کہیں رودِ عمیق
بے کراں تیز و کف آلود و عظیم
اجڑے سنسان دیار
اور دشمن کے گرانڈیل جواں
جیسے کہسار پہ دیودار کے پیڑ
عزّت و عفّت و عصمت کے غنیم
ہر طرف خون کے سیلاب رواں —
اِک سپاہی کے لئے خون کے نظّاروں میں
جسم اور رُوح کی بالیدگی ہے
تو مگر تاب کہاں لائے گی
تو مرے ساتھ مری جان کہاں جائے گی؟

دم بدم بڑھتے چلے جاتے ہیں
سرِ میدان رفیق ،

تو مرے ساتھ مری جان کہاں جائے گی؟
عمر گذری ہے غلامی میں مری
اس سے اب تک مری پرواز میں کوتاہی ہے!
زمزمے اپنی محبت کے نہ چھیڑ
اس سے اے جان پر و بال میں آتا ہے جمود
میں نہ جاؤں گا تو دشمن کو شکست
آسمانوں سے بھلا آئے گی؟
دیکھ خونخوار درندوں کے وہ غول
میرے محبوب وطن کو یہ نگل جائیں گے؟
اِن سے ٹکرانے بھی دے
جنگ آزادی میں کام آنے بھی دے
تو مرے ساتھ مری جان کہاں جائے گی؟

زوال

آہ پائندہ نہیں،
درد و لذّت کا یہ ہنگام جلیل!
پھر کئی بار ابھی آئیں گے لمحاتِ جنوں
اِس سے شدّت میں فزوں، اس سے طویل
پھر بھی پائندہ نہیں!

آپ ہی آپ کسی روز ٹھہر جائے گا
تیرے جذبات کا دریائے رواں
تجھے معلوم نہیں،
کس طرح وقت کی امواج ہیں سرگرم خرام؟
تیرے سینے کا درخشندہ جمال

کر دیا جائے گا بیگانہ نور
نکہت و رنگ سے محرومِ دوام!
تجھے معلوم نہیں؟
اس دریچے میں سے دیکھ
خشک، بے برگ، الم ناک درختوں کا سماں
کیسا دلدوز سکوت!
زیرِ لب نالہ کشِ جورِ خزاں!
چودھویں رات کا مہتاب جواں،
ان کے اُس پار سے ہے نزدِ طلوع۔
تجھے معلوم نہیں،
ایک دن تیرا جنوں خیز شباب
تیرے اعضا کا جمال
کر دیا جائے گا اس طرح سے محرومِ فسوں!
اور پھر چاند کے مانند محبت کے خیال
سارے اِس عہد کے گذرے ہوئے خواب
تیرے ماضی کے افق پر سے ہویدا ہوں گے
تجھے معلوم نہیں؟

اظہار

آہ میں بھی بھول جاؤں
زندگی سے اپنا ربطِ اوّلیں ؟
ایک دُور افتادہ قریے کے قریب
اِک جنوں افروز شام
نہر پر شیشم کے اشجارِ بلند
چاندنی میں اُن کی شاخوں کے تلے
تیرے پیمانِ محبّت کا وہ اظہارِ طویل !

رُوح کا اظہار تھے بوسے مِرے
جیسے میری شاعری، میرا عمل !

رُوح کا اظہار کیسے بھول جاؤں ؟
کیسے کر ڈالوں میں جسم و روح کو
آج بے آہنگ و نور ؟
تُو کہ تھی اُس وقت گمنامی کے غاروں میں نہاں
میرے ہونٹوں ہی نے دی تجھ کو نجات
اپنی راہوں پر اُٹھا لایا تجھے
زندۂ جاوید کر ڈالا تجھے
جیسے کوئی بُت تراش
اپنے بُت کو زندگی کے نور سے تاباں کرے
اُس کو برگ و بار دینے کے لئے
اپنے جسم و رُوح کو عریاں کرے
میرے بوسے رُوح کا اظہار تھے
رُوح تو اظہار ہی سے زندہ و تابندہ ہے
ہے اُسی کی یاد سے حاصل تجھے قربِ حیات ،
رُوح کا اظہار کیسے بھول جاؤں ؟

آنکھوں کے جال

آہ تیری مدبھری آنکھوں کے جال! ——

میز کی سطحِ درخشندہ کو دیکھ
کیسے پیمانوں کا عکسِ سیمگوں
اس کی بے اندازہ گہرائی میں ہے ڈوبا ہوا
جیسے میری رُوح، میری زندگی
تیری تابندہ سیاہ آنکھوں میں ہے
مے کے پیمانے تو ہٹ سکتے ہیں یہ ہٹتی نہیں!

قہوہ خانے کے شبستانوں کی خلوت گاہ میں
آج کی شب تیرا دزدانہ ورود!

عشق کا ہیجان، آدھی رات اور تیرا شباب
تیری آنکھ اور میرا دل
عنکبوت اور اُسکا بےچارہ شکار!
تیرے ہاتھوں میں مگر لرزش ہے کیوں؟
کیوں ترا پیمانہ ہونٹوں سے ترے ہٹتا نہیں!
خام و نوآموز ہے تو ساحرہ!
کر رہی ہے اپنے فن کو آشکار
اور اپنے آپ پر تجھ کو یقین حاصل نہیں!
پھر بھی ہے تیرے فسوں کے سامنے مجھ کو شکست
میرے تخئیلات میری شاعری بےکار ہیں!

اپنے سر پر قمقموں کے نور کا سیلاب دیکھ
جس سے تیرے چہرے کا سایہ ترے سینے پہ ہے
اس طرح اندوہ میری زندگی پر سایہ ریز
تیری آنکھوں کی درخشانی سے ہے۔
سایہ ہٹ سکتا ہے غم ہٹتا نہیں!

آہ تیری مدبھری آنکھوں کے جال!

دیکھ وہ دیوار پر تصویر دیکھ
یہ اگر چاہے کہ اس کا آفرینندہ کبھی
اس کے ہاتھوں میں ہو مغلوب واسیر
کیا ہی بے معنی ہے یہ اس کا خیال
اس کو پھر اپنی ہزیمت کے سوا چارہ نہیں!
تو مری تصویر تھی،
میرے ہونٹوں نے تجھے پیدا کیا
آج لیکن میری مدہوشی کو دیکھ
میں کہ تھا خود آفرینندہ ترا
پا بجولاں میرے جسم و روح تیرے سامنے
اور دل پہ تیری آنکھوں کی گرفتِ ناگزیر،
ساحری تیری خداوندی تری!
عکس کیسا بھی ہو فانی ہے مگر
یہ نگاہوں کا فسوں پایندہ ہے!

گناہ

آج پھر آ ہی گیا
آج پھر رُوح پہ وہ چھا ہی گیا
دی مرے گھر پہ شکست آ کے مجھے!
ہوش آیا تو میں دہلیز پہ افتادہ تھا
خاک آلودہ و افسردہ و غمگین و نزار
پارہ پارہ تھے مری رُوح کے تار
آج وہ آ ہی گیا!

روزنِ در سے لرزتے ہوئے دیکھا میں نے
خرّم و شاد سرِ راہ اُسے جاتے ہُوئے

سالہا سال سے مسدود تھا یارانہ مرا
اپنے ہی بادہ سے لبریز تھا پیمانہ مرا
اُس کے لوٹ آنے کا امکان نہ تھا
اُس سے ملنے کا بھی ارمان نہ تھا
پھر بھی وہ آ ہی گیا
کون جانے کہ وہ شیطان نہ تھا
بے بسی مرے خداوند کی تھی !

عہدِ وفا

تو مرے عشق سے مایوس نہ ہو
کہ مرا عہدِ وفا ہے ابدی!
شمع کے سایے سے دیوار پہ محراب سی ہے
سالہا سال سے بدلا نہیں سایے کا مقام
شمع جلتی ہے تو سایے کو بھی حاصل ہے دوام
سایے کا عہدِ وفا ہے ابدی!
تو مری شمع ہے میں سایہ ترا
زندہ جب تک ہوں کہ سینے میں ترے روشنی ہے،
کہ مرا عہدِ وفا ہے ابدی!

اِک پتنگا سرِ دیوار چلا جاتا ہے
خوف سے سہما ہوا خطروں سے گھبرایا ہوا
اور سایے کی لکیروں کو سمجھتا ہے کہ ہیں
سرحدِ مرگ و حیات اُس کے لئے!
ہاں یہی حال مرے دل کی تمناؤں کا ہے
پھر بھی تو عشق سے مایوس نہ ہو
کہ مرا عہدِ وفا ہے ابدی!

ہاں مرا عہدِ وفا ہے ابدی،
زندگی اُن کے لئے ریت نہیں دھوپ نہیں
ریت پر دھوپ میں گر لیٹتے ہیں آ کے نہنگ
قعرِ دریا ہی سے وابستہ ہے پیماں اُن کا
اُن کو لے آتا ہے ساحل پہ تنوع کا خمار
اور پھر ریت میں اِک لذّتِ آسودگی ہے!
میں جو سرمست نہنگوں کی طرح
اپنے جذبات کی شوریدہ سری سے مجبور
مضطرب رہتا ہوں مدہوشیٔ و عشرت کے لئے

اور تری سادہ پرستش کی بجائے
مرتا ہوں تیری ہم آغوشی کی لذّت کے لئے
میرے جذبات کو تو پھر بھی حقارت سے نہ دیکھ
اور مرے عشق سے مایوس نہ ہو
کہ مرا عہدِ وفا ہے ابدی!

شاعرِ درماندہ

زندگی تیرے لئے بسترِ سنجاب و سمور
اور میرے لئے افرنگ کی دریوزہ گری
عافیت کوشیٔ آبا کے طفیل؛
میں ہوں درماندہ و بےچارہ ادیب
خستۂ فکرِ معاش!
پارۂ نانِ جویں کے لئے محتاج ہیں ہم
میں، مرے دوست، مرے سینکڑوں اربابِ وطن
یعنی افرنگ کے گلزاروں کے پھول!

تجھے اِک شاعرِ درماندہ کی اُمید نہ تھی
مجھ سے جب وقت ستارہ ترا وابستہ ہوُا۔
تو سمجھتی تھی کہ اِک روز مرا ذہن رسا

اور مرے علم و ہنر
بحر و بر سے تری زینت کو گھر لائیں گے!
میرے رستے میں جو حائل ہوں مرے تیرہ نصیب
کیوں دعائیں تری بے کار نہ جائیں
تیرے راتوں کے سجود اور نیاز
اس کا باعث مرا الحاد بھی ہے!

اے مری شمعِ شبستانِ وفا،
بھول جا میرے لئے
زندگی خواب کی آسودہ فراموشی ہے!
تجھے معلوم ہے مشرق کا خدا کوئی نہیں
اور اگر ہے، تو سرا پردۂ نسیاں میں ہے
تو "مسرّت" ہے مری، تو مری "بیداری" ہے
مجھے آغوش میں لے
دو "انا" مل کے جہاں سوز بنیں
اور جس عہد کی ہے تجھ کو دعاؤں میں تلاش
آپ ہی آپ ہویدا ہو جائے!

دریچے کے قریب

جاگ اے شمعِ شبستانِ وصال
محملِ خواب کے اِس فرشِ طربناک سے جاگ!
لذّتِ شب سے ترا جسم ابھی چُور سہی۔
آمری جان مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ کِس پیار سے انوارِ سحر چومتے ہیں
مسجدِ شہر کے میناروں کو
جن کی رفعت سے مجھے
اپنی برسوں کی تمنّا کا خیال آتا ہے!

سیمگوں ہاتھوں سے اے جان ذرا
کھول مے رنگ جنوں خیز آنکھیں!

اسی مینار کو دیکھ
صبح کے نور سے شاداب سہی
اِسی مینار کے سایے تلے کچھ یاد بھی ہے:
اپنے بیکار خدا کے مانند
اُونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملّائے حزیں
ایک عفریت — اُداس
تین سو سال کی ذلّت کا نشاں
ایسی ذلّت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی!

دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
بے پناہ سیل کے مانند رواں
جیسے جنّات بیابانوں میں
مشعلیں لے کے سرِ شام نکل آتے ہیں!
ان میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ایک دلہن سی بنی بیٹھی ہے
ٹمٹماتی ہوئی ننھی سی خودی کی قندیل

لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے ان میں سے کوئی شعلہ جوّالہ بنے
ان میں مفلس بھی ہیں بیمار بھی ہیں
زیر افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں!

ایک بوڑھا سا تھکا ماندہ سا رہوار ہوں میں!
بھوک کا شاہسوار
سخت گیر اور تنومند بھی ہے
میں بھی اس شہر کے لوگوں کی طرح
ہر شبِ عیش گذر جانے پر
بہرِ جمعِ خس و خاشاک نکل جاتا ہوں۔
چرخِ گرداں ہے جہاں
شام کو پھر اسی کاشانے میں لوٹ آتا ہوں
بے بسی میری ذرا دیکھ کہ میں
مسجد شہر کے میناروں کو
اس دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں
جب انہیں عالم رخصت میں شفق چومتی ہے!

رقص

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں
ڈر سے لرزاں ہوں کہیں ایسا نہ ہو
رقص گہ کے چور دروازے سے آ کر زندگی
ڈھونڈ لے مجھ کو نشاں پا لے مرا
اور جرمِ عیش کرتے دیکھ لے!

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
رقص کی یہ گرد شیں
ایک مبہم آسیا کے دور ہیں

کیسی سرگرمی سے غم کو روندتا جاتا ہوں میں!
جی میں کہتا ہوں کہ ہاں،
رقص گہ میں زندگی کے جھانکنے سے پیشتر
کلفتوں کا سنگریزہ ایک بھی رہنے نہ پائے!

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی میرے لئے
ایک خونیں بھیڑیئے سے کم نہیں
اے حسین و اجنبی عورت اسی کے ڈر سے میں
ہو رہا ہوں لحظہ لحظہ اور بھی تیرے قریب
جانتا ہوں تو مری جاں بھی نہیں
تجھ سے ملنے کا پھر امکاں بھی نہیں
تو مری اُن آرزوؤں کی مگر تمثیل ہے
جو رہیں مجھ سے گریزاں آج تک!

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
عہدِ پارینہ کا میں انساں نہیں

بندگی سے اِس در و دیوار کی
ہو چکی ہیں خواہشیں بے سوز و رنگ و ناتواں
جسم سے تیرے لپٹ سکتا تو ہوں
زندگی پر میں جھپٹ سکتا نہیں!
اس لئے اب تھام لے
اے حسین و اجنبی عورت مجھے اب تھام لے!

بے کراں رات کے سناٹے میں

تیرے بستر پہ مری جان کبھی
بے کراں رات کے سنّاٹے میں
جذبۂ شوق سے ہو جاتے ہیں اعضا مدہوش
اور لذّت کی گرانباری سے
ذہن بن جاتا ہے دلدل کسی ویرانے کی،
اور کہیں اُس کے قریب
نیند، آغازِ زمستاں کے پرندے کی طرح
خوف دل میں کسی موہوم شکاری کا لئے
اپنے پر تولتی ہے چیختی ہے!
بے کراں رات کے سنّاٹے میں!

تیرے بستر پہ مری جان کبھی
آرزوئیں ترے سینے کے کہستانوں میں
ظلم سہتے ہوئے حبشی کی طرح رینگتی ہیں!

ایک لمحے کے لئے دل میں خیال آتا ہے
تو مری جان نہیں
بلکہ ساحل کے کسی شہر کی دوشیزہ ہے
اور ترے ملک کے دشمن کا سپاہی ہوں میں
ایک مدّت سے جسے ایسی کوئی شب نہ ملی
کہ ذرا روح کو اپنی وہ سبک بار کرے!
بے پناہ عیش کے ہیجان کا ارماں لے کر
اپنے دستے سے کئی روز سے مفرور ہوں میں!
یہ مرے دل میں خیال آتا ہے
ترے بستر پہ مری جان کبھی
بے کراں رات کے سنّاٹے ہیں!

شرابی

آج پھر جی بھر کے پی آیا ہوں میں
دیکھتے ہی تیری آنکھیں شعلہ ساماں ہو گئیں!
شکر کر اے جاں کہ میں
ہوں درِ افرنگ کا ادنےٰ غلام
صدرِ اعظم یعنی دریوزہ گرِ اعظم نہیں،
ورنہ اک جامِ شرابِ ارغواں
کیا بجھا سکتا تھا میرے سینۂ سوزاں کی آگ؟
غم سے مر جاتی نہ تو
آج پی آتا جو میں

جامِ رنگیں کی بجائے
بے کسوں اور ناتوانوں کا لہو؟
شکر کر اے جاں کہ ہیں
ہم درِ افرنگ کا ادنےٰ غلام
اور بہتر عیش کے قابل نہیں!

انتقام

اُس کا چہرہ، اُس کے خدّوخال یاد آتے نہیں
اِک شبستاں یاد ہے
اِک برہنہ جسم آتشداں کے پاس،
فرش پر قالین، قالینوں پہ سیج
دھات اور پتّھر کے بُت
گوشۂ دیوار میں ہنستے ہوئے!
اور آتشداں میں انگاروں کا شور
اُن بتوں کی بے حسی پر خشمگیں!
اُجلی اُجلی اونچی دیواروں پہ عکس
اُن فرنگی حاکموں کی یادگار

جن کی تلواروں نے رکھا تھا یہاں
سنگِ بنیادِ فرنگ!

اُس کا چہرہ اُس کے خدّوخال یاد آتے نہیں
اِک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم،
میرے "ہونٹوں" نے لیا تھا رات بھر
جس سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام
وہ برہنہ جسم اب تک یاد ہے!

اجنبی عورت

ایشیا کے دُور اُفتادہ شبستانوں میں بھی
میرے خوابوں کا کوئی روماں نہیں!
کاش اِک دیوارِ ظلم
میرے اِن کے درمیاں حائل نہ ہو!
یہ عماراتِ قدیم
یہ خیاباں، یہ چمن، یہ لالہ زار،
چاندنی میں نوحہ خواں
اجنبی کے دستِ غارت گر سے ہیں
زندگی کے ان نہاں خانوں میں بھی
میرے خوابوں کا کوئی روماں نہیں!

کاش اک "دیوارِ رنگ"
میرے ان کے درمیاں حائل نہ ہو!
یہ سیہ پیکر برہنہ راہرو
یہ گھروں میں خوبصورت عورتوں کا زہر خند
یہ گذرگاہوں پہ دیو آسا جواں
جن کی آنکھوں میں گرسنہ آرزوؤں کی لپک
مشتعل بے باک مزدوروں کا سیلابِ عظیم!
ارضِ مشرق، ایک مبہم خوف سے لرزاں ہوں میں
آج ہم کو جن تمناؤں کی حُرمت کے سبب
دشمنوں کا سامنا مغرب کے میدانوں میں ہے
اُن کا مشرق میں نشاں تک بھی نہیں!

خودکشی

کر چکا ہوں آج عزمِ آخری ——
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند۔
رات کو جب گھر کا رُخ کرتا تھا میں
تیرگی کو دیکھتا تھا سرنگوں
منہ بسورے، رہگذاروں سے لپٹتے، سوگوار!
گھر پہنچتا تھا میں انسانوں سے اُکتایا ہوا۔
میرا عزمِ آخری یہ ہے کہ میں
کود جاؤں ساتویں منزل سے آج!
آج میں نے پالیا ہے زندگی کو بے نقاب۔

آتا جاتا ہوں بڑی مدت سے میں
ایک عشوہ ساز و ہرزہ کار محبوبہ[1] کے پاس
اُس کے تختِ خواب کے نیچے مگر
آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو
تازہ و رخشاں لہو،
بوئے مے میں بوئے خوں اُلجھی ہوئی !
وہ ابھی تک خواب گہ میں لوٹ کر آئی نہیں
اور میں کر بھی چکا ہوں اپنا عزمِ آخری !
جی میں آئی ہے لگا دوں ایک بے باکانہ جست
اس دریچے میں سے جو
جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوئے بام کو !
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک یہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
آج تو آخر ہم آغوشِ زمیں ہو جائے گی !

(کتبہ محمد شریف عباسی ۔ جون ۱۹۴۱ء)

[1] مرادِ زندگی

1779